Women Writ

Classics

افسانے

ایک شوہر کی خاطر

عصمت چغتائی

RHOTAS LPS

Low Priced Series

ایک شوہر کی خاطر

افسانے

عصمت چغتائی

روہتاس بکس

اشاعت اول	1992ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبر 5 - ٹیمپل روڈ لاہور

ایک شوہر کی خاطر

ترتیب

کچھ میری یادیں

---- پطرس نے کہا!

عصمت کی شخصیت اردو کے لئے باعث فخر ہے انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیے ہیں کہ جب تک وہ کھڑی تھیں۔ کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اردو ادب میں جو امتیاز عصمت کو حاصل ہے اس سے منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

عصمت نے کہا!

ہنستے ہنستے بے جاں ہو کر نیر تخت سے نیچے لڑھک گئی۔

"بس کرو اللہ کا واسطہ" میں نے کرتہ کے دامن سے آنسو پونچھ کر خوشامد سے کہا ہمارے پیٹوں میں مروڑیاں اٹھ رہی تھیں۔ سانس پھول گئی تھی۔ ہنسی چیخوں میں بدل گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اگر ہنسی کا یہی زناٹا رہا تو کچھ دیر میں جسم بیچ میں سے دو ٹکڑے ہو جائے گا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بات بات پر ہنسی آتی تھی۔ کوئی پھسل پڑا ہنسی چھوٹ نکلی۔ مرغی نے کتے کے پلے کے ٹھونگ ماردی۔ وہ چیں چیں کر کے بھاگا اور قہقہوں کا طوفان ٹوٹ پڑا اور جو کہیں کسی نے پوچھ لیا کہ بھئی کیوں' ہنس رہی ہیں تو بس پھر تو ہنسی کا وہ شدید دورہ پڑ جاتا کہ معمولی مار پیٹ سے بجائے قابو میں آنے کے اور بھی تیز ہو جاتا' ہنسی آسیب بن کر سوار ہو جاتی ہنس ہنس کر شل ہو جاتے۔ ہڈیاں چٹخنے لگتیں جبڑے دکھ جاتے۔

کسی صورت افاقہ نہ ہوتے دیکھ کر اماں اپنی چپٹی سلیم شاہی لے کر تل پڑتیں اور ساری ہنسی ناک کے راستے نکال دینے کی دھمکی دیتیں۔ تب ہم ناکیں

پونچھتے پیٹ پکڑتے نیم تلے پڑے ہوئے اپنے مخصوص جھلنگے میں جاگرتے اور نئے سرے سے ہنسنے لگتے۔

عظیم بھائی کی کتابوں میں سے مضامین پطرس چرا کر پڑھنے کے بعد بھی ہم اسی قسم کی جان لیوا ہنسی کے بھنور میں پھنس گئے ہماری کھی کھی کھوں کھوں سے ہماری بردبار اور غمگین آپا کی سمع خراشی ہونے لگی۔ دو دھپ سر پر جمائے اور کتاب چھین لے گئیں۔ مگر یہ ہم نہ جانے کونسی بار کتاب پڑھ رہے تھے۔ ہمیں جملے کے جملے یاد ہوگئے تھے جو اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے دہرائے جاتے تھے اور قلابازیاں لگائی جاتی تھیں نہ جانے ایک عمر میں کیوں بے بات ہنسی آتی ہے۔ اب وہی مضامین پڑھتی ہوں تو اتنی ہنسی نہیں آتی۔

اس وقت تک عظیم بھائی نے مزاح نگاری شروع نہیں کی تھی یا شاید ہم نے ان کے مضامین نہیں پڑھے تھے۔ ملا رموزی کے مضامین پر اتنی ہنسی نہیں آتی تھی۔ جیسی کبھی آیا کرتی تھی کچھ پھیکے سے لگنے لگے تھے۔ نہ جانے کیوں بس پطرس بھا گئے اور ایک جان چھوڑ ہزار جان سے ان پر عاشق ہوگئے نہ جانے کیوں تخیل میں وہ اپنے ہم عمر سے نظر آئے تھے اور یقین تھا کہ اگر ان سے ملاقات ہو جائے تو ہم ضرور انہیں پیڑ پر بندھی اس بان کی کھٹولی پر چڑھا لے جائیں جو کنوئیں کے پاس نیم کی اونچی شاخوں پر شمیم اور چنو نے باندھ رکھی تھی۔

پطرس کی باتیں---- جی ہاں میں انہیں باتیں ہی کہوں کیوں کہ ان کی تحریریں بے ساختہ بولتی تھی۔ ان میں بڑی یگانگت اور قربت محسوس ہوتی تھی۔ ہمارے گھر کے زندہ ماحول میں بڑی بے تکلفی سے کھپتی تھیں چھوٹے بڑے سب ہی انہیں پسند کرنے لگے۔

عظیم بھائی نے "قصر صحرا" لکھی تو ہم نے جی جان سے پڑھی مگر "قرآن و پردہ"---- "حدیث و پردہ" بڑی بور معلوم ہوئیں۔ خشک مردہ کتابیں ان کے کچھ مضامین اقتصادیات پر "ریاست" میں نکلتے تھے وہ بھی ہمیں قطعی کھردرے معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے جب ہمیں پطرس کے مضامین اس رغبت

سے پڑھتے دیکھا تو کچھ مکدر سے ہو گئے۔

نانی عشو پڑھ کر ہنسنے کا دور گزر چکا تھا۔ سخت رومنٹک افسانوں سے کبھی شدید دلچسپی نہ رہی تھی یہی وجہ تھی کہ ہمیں پطرس بے طرح پسند آگئے۔ "میں ایک میاں ہوں" ہمارے گھر میں بالکل کیری کی چٹنی کی طرح چٹخارے لے کر پڑھا گیا۔ اماں تک نے پڑھ ڈالا۔ اور جب اپنی پلنگڑی پر بیٹھ کر وہ ہنسیں تو پان دان کی کلیاں پھدک پھدک کر آپس میں ٹکرانے لگیں۔ میں تنقید نگار نہیں نہ میں کوئی بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ "میں ایک میاں ہوں" کے بعد سے پطرس کا رنگ دوسرے مزاح نگاروں میں جھلکنے لگا۔ عظیم بھائی نے تو اپنی ایک کہانی میں اعتراف بھی کیا ہے۔ فرحت اللہ بیگ اور شوکت تھانوی کے ہاں بھی وہی رنگ جھلکنے لگا۔ میں مزاح نگاری کی تاریخ نہیں لکھ رہی ہوں کیونکہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان میں سے پہلے اس انداز میں کس نے لکھنا شروع کیا مجھے آج تک نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کس سے متاثر ہوا اور کس نے کس کی پیروی کی۔ مگر میرے مطالعے کی تاریخ میں پہلا نام پطرس کا آتا ہے میں پطرس کو اپنی جانب سے کوئی مقام نہیں دینا چاہ رہی ہوں مجھے تو بس یہ کہنا ہے ایک عمر میں پطرس کی تحریریں دل کو ایسی لگی تھیں کہ ہم نے ایک دن جوش میں آکر پطرس کو خط لکھ مارا۔ ابا میاں کے بکس سے لفافہ اور ٹکٹ چرایا اور معرفت--- "تہذیب نسواں"--- خط بھیج کر جواب کا انتظار کرنے لگے۔

یا اللہ تیری ہر بات میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسی پر تو میں خدا کے وجود کی قائل ہوں۔ وہ خط قبلہ ممتاز علی صاحب نے کھول لیا اور مع لفافہ کے آپا کو جنہیں انہوں نے منہ بولی بیٹی بنایا تھا بھیج دیا۔ بلی مظلوم سی ایک چوہیا پکڑ لیتی ہے اور کم بخت اس سے مذاق کرتی ہے۔ کبھی دانت مار دیا۔ کبھی گدگدا دیا کبھی پنجہ سے لڑھکا دیا۔ اس خط کے آنے کے بعد کئی روز ہماری گت اسی طرح بنتی رہی۔ ہمارا خط اونچی آواز سے ابا کے سامنے پڑھا گیا۔ ہر فل سٹاپ پر سر پر چپتیں پڑتی جاتیں۔ خط میں ہم نے انہیں مسخر لونڈا سمجھ کر نہایت بے تکلفی فرمانے کی کوشش

کی تھی۔ اب تک اس خط کا ایک ایک حرف دماغ پر داغا ہوا ہے۔ برسوں خیال ہی سے پسینے چھوٹ جایا کرتے تھے۔ خط ہمیں تنبیہہ دینے کے لئے بار بار پڑھا جاتا تھا۔ ہم نے نہایت بے تکلفی سے اپنی دانست میں بالکل پطرس کے رنگ میں لکھا تھا۔ سب سے بھیانک جملہ تھا۔

"ابے پطرس! کیا تو گھاس کھا گیا ہے؟"

"عوام" اس جملے سے ہماری دھجیاں بکھیرتے تھے۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ بے تکلف ہمارے سر پر چپت جڑ دے۔ ظاہر ہے کہ اس صلائے عام پر ہر نکتہ دان نے لبیک کہا۔ ہم حضرت ممتاز علی صاحب اور پطرس کی جان کو کوستے تھے۔ ہم مجرم جو تھے صرف اس لئے نہیں کہ پطرس سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اس لئے بھی کہ ہم نے اس لفافے پر ٹکٹ نہیں لگایا تھا اس پر "سروس" لکھا تھا جو صرف سرکار کی ڈاک کے استعمال کے لئے ہوتا تھا۔ آٹھ آٹھ آنے جرمانہ الگ ٹھکا۔ سچ پوچھئے تو اس سانحہ کے بعد پطرس ہماری چڑ بن گئے۔ ہماری شیطانوں کی فہرست بناتے وقت ہمیشہ اس واقعہ کو تکلیف دہ حد تک اہمیت دی جاتی۔

بعض اوقات ایک چھوٹی سی بات کا دل پر کتنے دن نقش رہتا ہے۔ برسوں گزر گئے لوگ بھول بھال گئے۔ مگر شاید دماغ نے ایک ننھی سی گانٹھ باندھ لی۔ بمبئی میں آئے سال بھر گزرا ہوگا کہ ایک دن ریڈیو سٹیشن سے کسی صاحب نے فون کیا کہ بخاری صاحب آج کل بمبئی آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پہلا خیال یہ آیا کہ کوئی بہانہ کردوں کہہ دوں کے بیمار ہوں' پھر سوچا یہ کیا حماقت ہے۔ پطرس آئے ہیں یعنی سچ مچ پطرس آئے ہیں وہ مجھے قطعی قابل ملاقات سمجھتے ہیں۔ جب ہی تو بلایا ہے۔ خیر لنچ کا وعدہ رہا۔

مگر میں نے شاہد سے کوئی ذکر نہیں کیا انہوں نے بلایا تو شاہد کو بھی تھا لیکن میں نے بہانہ کر دیا کہ انہیں قطعی فرصت نہیں' وہی میری نیم کے نیچے پڑے ہوئے جھلکنے والی ذہنیت! یہ ڈر کم بخت کاہے کا تھا۔ ٹھہریئے آگے چل کر بتاؤں گی۔

مجھے ضرورت سے زیادہ ذہین اور جملہ باز لوگوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ان

کی شخصیت اپنی جانب کھینچتی بھی ہے۔ اور دور بھی دھکیلتی ہے اور پھر پطرس کا مجھ پر ویسے ہی رعب بیٹھا ہوا تھا۔ خواہ مخواہ ان سے مل کر اور احساسِ کمتری دوگنا ہو جائے۔ بڑی کوفت ہوئی۔ نہیں جاتی ہوں تو نہ جانے پھر کتنا پچھتانا پڑے۔ جاتی ہوں تو اللہ! نہ جانے کیسی چوٹیں گے۔ ضرور میں بدتمیزی پر اتر آؤں گی۔ قطعی جو جھیل جاؤں میں نہیں چاہتی تھی کہ "شاہد کے سامنے میرا پول کھول جائے۔ وہ فوراً منٹو سے کہہ دیوں گے کہ پطرس نے محترمہ کو پٹخنیاں دیں کہ گھگھی بندھ گئی۔"

رات بھر میں نے ان تمام جملوں کے جواب سوچے جو وہ کہیں گے اور میں منہ توڑ جواب دوں گی۔ بدقسمتی سے میری ساری محنت رائیگاں گئی۔ پطرس نے وہ سوال ہی نہ کئے۔ اف میری حماقت! میں نے اپنے پروفیسروں سے کبھی ہار نہ مانی۔ میرے استاد میری منہ زوری سے چوکنے رہتے تھے۔ میری کئی آستانیاں کلاس میں آنسو بھر لاتیں یہ میرا خاندانی ورثہ ہے اور مجھے اس پر بڑا ناز تھا۔ مگر اس دن احساس کمتری بے طرح بھوت بن کر گلا دبوچنے لگا۔ میں نے پطرس کی زندگی میں کبھی کسی سے ان احساسات کا ذکر نہ کیا۔ کوئی گلے پر چھری رکھ دیتا۔ تب بھی نہ کرتی۔ کسی نے بچپن میں مجھے ہوا بن کے ڈرانے کی کوشش کی۔ تو میں نے اس ہوے کی پنڈلی کی بوٹی اتار لی تھی۔ اور بجائے ڈرنے کے ڈرانے والے کی چیخیں نکل گئیں تھیں۔ مگر پطرس کے ہوے نے مجھے ہولا ہولا کر شل کر دیا۔ میں نے اپنے لباس کے بارے میں کبھی غور نہیں کیا۔ مگر اس دن میں نے بڑے سوچ بچار کے بعد ایسی ساڑھی نکالی جس کا ذہن پر کوئی دھندلا سا نقش بھی نہ رہ جائے تاکہ کوئی حوالہ نہ دیا جا سکے۔ ہر شے مبہم ہو جائے۔ پطرس کے سامنے دال تو گلے گی نہیں صرف غائب ہو جانے والی ٹوپ پہننے ہی میں عافیت ہے۔

جب ریڈیو اسٹیشن جانے لگی تو دل سے دعا نکلی کاش پطرس بیمار پڑ گئے ہوں یا میرے ہی پیٹ میں درد اٹھ آئے۔ ہسپتال سے فون کروا دوں کہ آخری وقت ہے۔ لعنت ہے عصمت کی بچی تجھ پر پھر تو وہ ضرور ہسپتال عیادت کو آئیں گے۔ بیگم اب تو مرنے میں بھی رہائی نہیں۔ کاندھا دینے تو وہ آ ہی پہنچیں گے پھر میرے

چغتائی خون نے للکارا- میرے سگڑ دادا نے کھوپڑیوں کا مینار چنوا کر اس پر بیٹھ کر خاصا تناول فرمایا تھا- اور میں ایک حقیر پطرس کی دہشت میں فنا ہوئی جا رہی ہوں- ایسا بھی کیا ہے ٹانگیں کھینچیں گے تو اپنی ازلی بد زبانی پر اتر آنا مزاج ٹھکانے آجائیں گے شاہ صاحب کے!

لیجئے بسم اللہ ہی غلط ہوئی- ریڈیو اسٹیشن کے دفتر میں پہنچی تو تم کاغذوں پر سر جھکائے بیٹھے تھے-

"آداب عرض!"

"گڈ مارننگ" جواب ملا-

"اف بور" میں نے سوچا اب فراٹے کی انگلش کا رعب ڈالیں گے- وہ کاغذوں پر جھکے تھے- میں نے غور سے معائنہ شروع کردیا- "صورت تو کچھ زیادہ توپ نہیں"- میں نے سوچا سیدھی سادھی سانولی سلونی شکل ہے مگر تصویر سے نہیں ملتی- قطعی مختلف!

"کتنے دن قیام رہے گا" میں نے انہیں کاغذوں میں سے ابھرے- "میرا تبادلہ بمبئی کا ہوگیا ہے"

"یہ لیجئے سنا تھا کسی میٹنگ کے سلسلہ میں بمبئی آئے ہیں- بہت جلد جانے والے ہیں یہ آخر مجھ سے جھوٹ کیوں بولا- کوئی اس میں بھی چال ہوگی اس سے قبل کہ کوئی اور سوال جھاڑتی- فرمانے لگے-

"چلیے!"

"خاصہ بور ہے" میں نے بٹوہ اٹھا کر پیچھے چلتے ہوئے پوچھا- یہ دانت کیوں بار بار نکوستا ہے؟ سارا ریڈیو اسٹیشن گھما کر ایک کمرے میں مجھ سے جانے کو کہا- سامنے میز پر ایک اونچے کاغذوں کے ڈھیر کے سامنے ایک عقاب کی سی صورت کا لورا چٹا پٹھان بیٹھا ہوا تھا- طوطے جیسی لمبی ناک' بھاری بھاری آنکھیں-

"آیئے آیئے--- معاف کیجئے گا میری ٹانگ ذرا لمبی کھینچ گئی"-

"اوہ" میں نے سانولے سلونے پطرس کے جانے کے بعد کہا "میں سمجھی تھی

آپ وہ ہیں"۔

"کیا؟---- میں وہ ہوں---- آپ میری ہتک کر رہی ہیں" وہ برا مان گئے۔ وہ بکستمن ہیں اور میں قطعی وہ نہیں ہوں" ایک جھٹکے سے سارا اعصابی دباؤ بھک سے اڑ گیا۔ ایئر کنڈیشن کمرے میں ایک دم مجھے نیند سی آنے لگی۔ یا خدا ناحق میں نے اس شخص کی اپنی جان پر اتنی ہیبت سوار کرلی ایسا معلوم ہوا میں انہیں برسوں سے جانتی ہوں یہ عقاب تو قطعی فاختہ نکلی پھر جو باتوں کا ریلا چلا ہے تو میرا سارا ریہرسل بے کار ہوگیا۔ سارے تراشے ہوئے جملے اڑن چھو ہوگئے۔ تاج محل ہوٹل پہنچتے پہنچتے دو چار مسائل پر اختلاف بھی ہوگیا۔ میرے خیال میں پطرس کی خاصیت یہی تھی کہ ان سے ملتے ہی برسوں کی ملاقات کا احساس ہونے لگتا تھا۔ یہ معلوم کرکے بھی حیرت ہوئی اور مسرت بھی کہ انہوں نے اس زمانے کے لکھنے والوں کا ایک ایک لفظ بڑی دلچسپی سے پڑھا تھا اور یاد رکھا تھا۔ انہیں جملے کے جملے ازبر تھے۔ شعر تو میں نے بہت لوگوں کو یاد رکھتے سنا ہے مگر نثر صرف پطرس کی زبان سے اس طرح سنی۔

"میرے کمرے میں چلنے پر کوئی اعتراض؟" بڑی بے تکلفی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ٹھیک آیئے۔"

یہ اطلاع مجھے بعد میں ملی کہ پطرس نہایت لوفر انسان ہیں۔ اس وقت مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ میری ڈھیٹ کہانیوں کی وجہ سے لوگ مجھے بڑی نٹ کھٹ سمجھتے ہیں۔

میں نہایت بے تکلفی سے آرام کرسی پر دراز لیمونیڈ چکھتی رہی۔ وہ پلنگ پر پھیلے ٹھنڈی بیئر کی چسکیاں لیتے رہے اور وہ قینچیاں اپنی پوری رفتار سے چلتی رہیں۔ باتوں کے طوفان میں بار بار یہ محسوس کرکے سخت کوفت ہوتی رہی کہ پطرس کا مطالعہ اور مشاہدہ اتنا وسیع ہے کہ برسوں کھلی گھونگی پر تل کر عبث نہ ہوسکے گی۔ اس لئے کیوں نہ قنوطیت پر اتر آؤں اور اپنی خاندانی کج بحثی کام میں لاؤں کہ بڑے

بڑے سورماؤں پر آزمایا ہوا نسخہ ہے جہالت اور کم مائیگی کے لئے بہترین ڈھال۔
مگر یہ بہت جلد معلوم ہو گیا کہ غنیم نہایت چوکس ہے مجھ سے کئی سال پرانا اور اکھاڑنے کا کج بحث ہے تیر کی نوک بڑی چابک دستی سے واپس لوٹا دیتا ہے۔ اس میدان میں بھی کھلی بات سے بہتر ہے اسے بزرگ مان کر ہتھیار ڈال دوں۔ شاگرد بن کر مسکین صورت سے سوالات کروں اور یہ لکچر جھاڑ کر حلق خشک کرے۔ موقع پاؤں تو ڈنگ مار دوں۔ مگر توبہ کیجئے پطرس گھسے میں آنے والے آسامی نہ تھے۔ میرے ہر ذہین اور دقیق سوال میں نہایت بھونڈے پن سے "ہٹائیے بھی یہ بورنگ باتیں" کہہ کر میرا خوب جی جلایا۔
میں نے بھی چڑ کر ان کی ہر بات کو الٹ کر بحث شروع کر دی۔ انہوں نے میرے ہر پسندیدہ شاعر کو اور ادیب کو جاہل اور الّو کہہ دیا۔ میں نے بھی کلس کر نہایت تہذیب اور سلیقہ سے انہیں احمق کہہ دیا جس پر وہ بے تحاشہ ہنسے۔ میں نے پھر چڑھ کر ان کا ساتھ گو جی یہ چاہ رہا تھا۔ سرہانے رکھا ہوا لیمپ اسٹینڈ ان کے سر پر گر پڑے اور میں ہنستی رہوں۔
"ارے ڈیڑھ بج گیا" گھڑی دیکھ کر وہ جلدی جلدی اپنا گلاس ختم کرنے لگے۔ پھر بھاری بھاری آنکھوں سے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں بالکل کوڑھ مغز ہوں اور پھر بے اختیار ہنسنے لگے۔ بالکل میرے بدذات بھائی چنو کی طرح۔ ایک دفعہ اس کے چڑانے پر میں نے گال پر ایسا پنجہ مارا تھا کہ چربی نکل آئی تھی۔
"جلدی چلنا چاہئے ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔" مطلع صاف ہو گیا اور ہم نہایت اطمینان سے ڈائیننگ ہال میں جاکر مینو پڑھنے لگے۔ "اف یہ فرنچ کھانوں کے نام مجھے بڑے گندے لگتے ہیں" میں نے پھر جلانے کی کوشش کی۔ "سب کھانے سارڈین کی طرح بدبودار اور لیس سے معلوم ہوتے ہیں۔" اس کے بعد مچھلیوں، گھونگوں اور سیپوں پر بحث ہونے لگی اب انہوں نے ایک دوسرا طریقہ نکالا ہر بات پر اتفاق کرنے لگے جس پر کوفت دوگنی ہو گئی اور میں اس نتیجہ پر پہنچی کہ پطرس اتر جائیں تو دکھن جانے میں ہی عافیت ہے۔ میں نے چاہا ان کی تحریروں کے بارے

میں بات کروں مگر اس عرصے میں ہمارے تعلقات اتنے کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ بھڑک گئے اور یہ بجا بھی تھا اس وقت میں ان کی کہانیوں کی تعریف کر کے ان کے چہرے پر آنے والی جھپکیوں پر مسکرا کر جی ٹھنڈا کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ فوراً "ادب کی محفل سے چھلانگ مار کر کھانے پر آگئے۔ کافی بد مزہ کھانا تھا۔ اسٹو کچا تھا جیسے چمڑہ چبا رہے ہوں اشارے سے بیرے کو بلا کر بڑی لجاجت سے بولے۔

"دوست یہ بکرا تو سینگ مار رہا ہے کوئی مرا ہوا جانور نہیں پکا تمہارے ہاں" بیرا بے چارہ کھسیانا ہو کر ہنس دیا اور جب وہ پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا تو ایک دم سے بولے۔

تم نے لکشمنن کو پطرس کیوں سمجھا اگر گدھے کو پطرس سمجھ لیا ہوتا تو مجھے قطعی شکایت نہ ہوتی" میں نے اتنی زور سے ٹھٹھہ مارا کہ ہال میں مہذب لوگ بد بد کرتے کرتے ایک دم چونک کر دیکھنے لگے۔ پطرس نے تادیبی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔

"درمیانہ درجہ کی' چار دیواریوں میں پلی ہوئی لڑکی تاج محل ہوٹل کے آداب سے کیسے واقف ہو سکتی ہے ان کا خیال ٹھیک تھا۔" اس سے پہلے میں نے صرف ایک دفعہ تاج میں چائے پی تھی۔ اس وقت یہ پہلا اتنا شاندار ہوٹل جسے صرف دیکھنے کے لئے گئی تھی سجاوٹ اور صفائی کو ہمارے گھر میں نہایت تحقیر کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ ہمارے گھر میں کھانے کی میز تو تھی اور جب نہایت غیر دلچسپ قسم کے مہمان آتے تھے۔ تب اس پر سے سلائی کی مشین' اچار کی برنیاں اور بچہ کا گدولنا اتار کر تخت کے نیچے دوسرے کاٹھ کباڑ کے ساتھ چھپا دیا جاتا تھا۔ خاص مہمانوں کی چادر بچھا کر چینی کی پلیٹیں سجا دی جاتی تھیں۔ آپا بڑے چاؤ میں آکر نیپکن کے پھول بنا کر گلاسوں میں سنوار دیتیں۔ ہم لوگ اسے احمقانہ بناوٹ اور بے کار کی زحمت سمجھ کر نہایت تحقیر سے ہنستے اور انہیں چڑانے کو گلاس میں سے نیپکن نکالے بغیر پانی بھر لیتے۔ آپا مہمانوں کے سامنے ہمارے جنگلی پن کی وجہ سے شرمندہ ہوتیں تو بڑا لطف آتا۔ ہم لوگ تو تانبے یا تام چینی کی رکابیوں میں کھانا لے

کر بان کی چارپائی پر سینی رکھ کر بیٹھ جاتے۔ ذرا پلنگ کی آدوائین ڈھیلی ہوتی تو بڑا مزا آتا۔ کوئی موٹا آدمی بیٹھ جاتا تو سارا شوربہ گود میں رس آتا۔ بان کی ڈھیلی چارپائی پر بیٹھ کر پتلے شوربہ کا سالن کھانا بھی ایک فن ہے۔ جس میں ہمارا گھرانا ماہر تھا۔

تاج محل ہوٹل میں کانٹے چھری سے کھانا کھاتے وقت میرے کندھے انجانے بوجھ سے تھک گئے اور چغتائیت کو سخت ٹھیس لگی اور مجھے فوراً احساس برتری ہونے لگا کم از کم اس میدان میں تو مجھے فوقیت حاصل تھی۔ پطرس کو روز روز اسی طرح طم طراق سا کھانا پڑتا ہوگا انہوں نے شاید کبھی کھاٹ پر بیٹھ کر آلو گوشت نہیں کھایا ہو گا۔ خاص کر جب کہ اس میں پڑوسی کے باغ سے چرا کر نیبو نچوڑا گیا ہو۔ اس کے بعد بیرے نے پلیٹوں میں نہ جانے کیا لاکر رکھ دیا۔ باتوں میں خیال ہی نہ رہا۔ بڑے دھواں دار طریقے پر کرشن چندر، بیدی اور منٹو پر بحث ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا میں تکلف میں ان کی تعریفیں کرتی ہوں تاکہ لوگ مجھے بڑا دریا دل سمجھیں اور میں کہتی تھی میں خدا کی بھی جھوٹی تعریف نہیں کروں گی۔ ان کی کہانیاں میں نے تنقید نگار یا ایک کہانی نگار کی حیثیت سے نہیں ایک انسان کی حیثیت سے دل بہلانے کو پڑھی ہیں۔ کچھ بری بھی لگی ہیں اور کچھ نشتر بن کر دل میں ترازو ہو گئی ہیں۔

"یہ جذباتیت ہے" انہوں نے رکھائی سے کہا۔

"جذباتیت کیا ہوتی ہے؟" میں نے بھونڈے پن سے کہا وہ سمجھے میں بن رہی ہوں حالانکہ یہ سولہ سال پہلے کی بات ہے اور واقعی میری سمجھ میں بہت سی باتیں نہیں آئی تھیں۔ میں نے بہت سی باتوں کے نامعقول جواب دیئے تھے۔ ان کی علمی بندگی کی قائل ہوتے ہوئے بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں کہا کہ میں کب سے اور کتنی ان کی مختصر سی تحریروں کی مداح ہوں۔ میں نے بہت کم ان کی تعریف میں کہا جو کہا وہ نہایت بے رخی سے سنی ان سنی کر گئے۔ ان کی اپنی تخلیقات ان کے لئے اتنی اہم نہیں تھیں۔ کم سے کم مجھے تو یہی اندازہ ہوا کہ وہ خود پرست نہیں۔

دو گھنٹے لنچ سے کھیلتے گزر گئے۔

"آپ ڈرامہ کیوں لکھتی ہیں؟" انہیں اچانک بم گرانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔

"یونہی" میں نے لنگڑا سا جواب دیا۔

"میری رائے میں تو آپ ڈرامے لکھنا چھوڑ دیجئے۔ بڑے اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں۔ کوئی ایکٹ چھوٹا کوئی لمبا۔ سلیقہ سے کنز یونٹ کرنے کے بجائے آپ انہیں دانتوں سے کھسوٹتی ہیں۔" ان کی بوجھل عقابی آنکھوں میں ایذا رسانی کی لذت کا نشہ ابھر آیا۔

جی چاہا میز کا سارا کوڑا کرکٹ ان کے اوپر لوٹ دوں اور یہ پلٹس کے مزے کی پڈنگ ان کے شاندار سوٹ پر لسٹر جائے۔ مگر میں نے جلدی سے بھڑکتے ہوئے راہوار کی لگامیں کھینچ لیں اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی حلق میں اتار کر نہایت نرمی سے کہا۔ "اچھا---- اب نہیں لکھوں گی" انہیں ناامیدی سی ہوئی کہ میں نے بحث کیوں کاٹ دی۔

"مکالموں میں آپ کے کافی جان ہوتی ہے۔" اونہہ' میں نے سوچا۔ یہ میرے مکالمے تھوڑی ہوتے ہیں گھر میں سب ایسے ہی بولتے ہیں میں دوسری زبان کہاں سے لاؤں۔

"برنارڈ شا سے متاثر نہیں؟"

"بے حد' میں نے ایک ڈرامہ میں برنارڈ شا کے یہاں سے پورا کا پورا سین اڑا لیا ہے کیوں کہ مجھے وہ سین بہت پسند آیا تھا۔ اس کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ مجھے اپنی آنے والی ذمہ داریوں کا اس وقت تک اندازہ نہیں تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ ایک دن "جواب داری" کرنا ہوگی۔ اصل میں میں نے وہ سین ایک فلمی کہانی کے لئے اڑایا تھا۔"

میں نے سوچا اس سے پہلے یہ میری ٹانگ کھینچیں خود ہی کیوں نہ سر پھوڑ لوں۔ آپ بھی کے۔جردم۔جرلوم اور پی۔ جی وڈہاؤس سے متاثر ہوئے ہوں گے۔" میں نے کہہ تو دیا لیکن اب سوچتی ہوں کہ صرف ایک بات مشترک تھی یعنی دونوں

مزاح نگار تھے- شاید چڑھ کر کہہ دیا ہوگا وہ نہایت ہوشیاری سے ٹال گئے اور اشارے سے بیرے کو بلایا- بڑی پریشان صورت بنا کر چاروں طرف دیکھا-

"معاف کیجئے گا-" بڑے ادب سے مجھ سے معذرت چاہی پھر سرگوشی میں بیرے سے کچھ کہا- وہ بڑے زور زور سے سرہلانے لگا-

"صاحب آپ اطمینان رکھو- کوئی بات نہیں-" بیرے نے ہمت بڑھائی-

"نہیں اگر کوئی اعتراض ہو تو----" پھر سہم کر چاروں طرف دیکھا-

"آپ بولو صاحب"

"مینجر کو تو کچھ----"

"نہیں صاحب مینجر کو کون بولے گا؟---- ہم کو بولو----"

پطرس نے بڑی شکر گزار نظروں سے اسے دیکھا پھر بالکل کان کے پاس ہونٹ لے جاکر بولے-

"کافی"

"کافی؟" بیرا چکرایا-

"ہاں! اور نمکین بسکٹ بھی، بیرا مجسم سوال بنا کبھی مجھے اور کبھی انہیں دیکھنے لگا-

"کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلے---- شاباش-"

"نہیں صاحب اطمینان رکھو"---- بھونچکا سا بیرا کافی لینے چلا گیا- جاتے جاتے اس نے حیرت زدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا جیسے کہتا ہو- دماغ تو سلامت ہے حضور کا' پطرس نے نہایت معنی خیز انداز میں آنکھ ماری بے چارہ گھگیا کر ہنسنے لگا-

اور مجھے معلوم ہوا پطرس مزاح نگار ہی نہیں ان کی زندگی میں شرارت اور چلبلا پن ہے- ان کی زبان میں لطیفے ہیں اور برتاؤ میں ہلکا پھلکا پن ان کے طنز میں تیکھا پن ہے انہوں نے زندگی کا تنگ و تاریک رخ نہیں دیکھا- وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے- ~~آزاد زندگی کا تنگ و تاریک رخ نہیں دیکھا- وہ الجھنوں کا شکار نہیں تھے-~~ آزاد زندگی کے قائل تھے- یہی وجہ تھی وہ نئے لکھنے والوں کی تلخی اور

جھنجلاہٹ سے مکدر سے ہو جاتے تھے۔

جسم فروشی اور حرامی بچوں کے سوال کو وہ کچھ مہذب نہیں سمجھتے تھے۔ ان دنوں میں کسی سے بھی ملتی تھی "لحاف" کا ذکر چھڑ جاتا تھا۔ میری چڑھ سی ہو گئی۔ پطرس نے لحاف ہی نہیں اور بھی جنسی الجھنوں پر کوئی بحث نہ کی۔

"میں اپنی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ کرانا چاہتی ہوں" میں نے انہیں ذرا رعانیت کے موڈ میں پاکر کہا۔

"کیوں؟" وہ بڑے کھرے پن سے بولے "آپ کی کہانیاں ترجمہ نہ ہوں گی تو کیا انگریزی ادب غریب رہ جائے گا یا شاید آپ کا خیال ہے۔ انگریزی کا جامہ پہن کے تحریر زیادہ بلند ہو جائے گی۔"

پھر جی جلا۔ ایک دم سے یہ انسان اتنا خشک کیوں ہو جاتا ہے" نہیں، یہ بات تو نہیں اصل میں انگریزی میں چھپنے سے پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ احمد علی نے ایک کہانی کے مجھے چار پونڈ دلوائے تھے۔"

کچھ لاجواب سے ہو گئے اور مسکرانے لگے۔ "فکر نہ کیجئے ایک دن آئے گا لوگ خود ہی اس طرف توجہ دیں گے۔" پھر میں نے فکر نہ کی۔

ایک ایک لمحہ پر لطف گزرا۔ گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد بھی ابھی زنبیل میں بہت کچھ تھا وہ مجھے چرچ گیٹ اسٹیشن تک چھوڑ گئے میں ان دنوں ملاڈ پر رہتی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے بارے میں ایک مضمون لکھا۔ جو میں نے نہیں پڑھا لوگوں سے ٹکڑے سنے۔ ایک بار دہلی جانا ہوا تو دعوت میں بلایا وہاں فیض بھی تھے۔ مگر بڑی چپ چاپ سی محفل تھی۔ جس کا میرے دماغ پر دھندلا سا بھی عکس نہیں کچھ سیاست کی باتیں زیادہ ہوئی جو میرے پلے نہیں پڑیں۔

سال بھر بعد میں نے نوکری سے استعفا دے دیا۔ شاہد کی نوکری بھی کچھ ڈھل مل سی نظر آنے لگی۔ میں نے پھر نوکری کا ارادہ کیا۔ نہ جانے کیا دل میں سمائی پطرس کو لکھ مارا کہ نوکری چاہئے کہیں بھی ملے۔ چار پانچ سو سے کم میں گزر نہیں ہوگی۔ ہفتہ بھر کے اندر چھ سو روپے کی نوکری معہ تقرر کے خط کے مل گئی۔ اس

عرصہ میں مجھے ایک فلم کا کام مل گیا تھا اور شاہد کو بھی ڈائرکشن مل گیا۔ میں نے پطرس کو بڑی شرمندگی کا خط لکھا۔ معافی مانگی۔

پھر ملک تقسیم ہو گیا۔ جاگیریں بٹیں، زبان بٹی، ادب بٹا اور ادیبوں کا بھی بٹوارا ہو گیا۔ آدھا کنبہ یہاں آدھا وہاں چلا گیا۔ پطرس ادب کی دنیا سے سیاست کے آسمان پر پہنچ گئے۔

مگر نقوش میں ان کا ایک خط پڑھ کر نجانے کیوں محسوس ہوا۔۔۔۔ پطرس دور جا کر بھی پاس ہی کھڑے ہیں آج ہی میں نے مضامین پطرس خریدی ہے پڑھ رہی ہوں ~~پڑھ رہی ہوں~~ پڑھ کر پلنگ سے نیچے گرنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر میرے دل و دماغ کی تکان سی اتر رہی ہے وہ قلم جو تھکے ہوئے دماغوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی مہلت بخش دے خاموش ہو چکا۔ مگر دور میرے تخیل میں دو بھاری بھاری غلافی آنکھیں آج بھی بے ساختہ مسکرا رہی ہیں۔
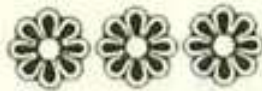
جانی دشمن

عالیہ نے حیرت سے پرچے کو دوبارہ پڑھا- خالہ جان نے اسے بلایا تھا- وہ اس کی خالہ جان خاک بھی نہ تھی- وہ اپنی سہیلیوں کی ماؤں نانیوں سے ایسے ہی خالہ، چچی، پھوپی کا رشتہ لگا لیا کرتی تھی- اس نے کچھ عادت ہی رشتہ جوڑ قسم کی پائی تھی- کالج میں قدم رکھتے ہی جو بہناپے کرنا شروع کئے تو اپنی کلاس کی لڑکیاں تو خیر تھیں ہی، گھٹنہ پھوڑے کی ہر کلاس میں دوستی اور رشتے کا بیج بو ڈالا- اور تو اور استادوں سے بھی باوا آدم کے رشتے سے میل جول بڑھا لیا- چھل لئے چلی آ رہی ہیں- ساڑھیاں کڑھوائے دیتی ہیں- سویٹر بن رہی ہیں- اور دعوتوں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں- آج نذر نیاز ہے، تو کل کسی بھائی بھتیجے کا مونڈن یا سالگرہ کبھی دور دراز کے رشتہ داروں کی شادی کے رقعے بانٹتی پھر رہی ہیں، تو ساتھ ساتھ دلہن دولہا، دونوں کی طرف سے شرکت کے لئے اصرار کئے جاتی ہیں-

جو جل کر انہیں چڑاتا، وہ انتقاما" اسی کے گلے پڑ جاتیں اور اتنی شدید دوستی کر کے چھوڑتیں کہ توبہ- کسی کو جھوٹی حاضری لگوانی ہو، آپ سینہ سپر- کسی کو اپنے یار غار سے ملنا ہے آپ ادھر ادھر کے ناطے جوڑ جاڑ اپنے گھر میں دونوں کو بلانے پر بضد کوئی چندہ جمع ہو رہا ہے، عالیہ بیٹا سب سے آگے-

"ارے بھئی تم ٹھہریں سنی جماعت، شیعہ لڑکیوں کی مجلس سے واسطہ؟"

"ارے اللہ قسم بڑا مزا آئے گا- مسرور فاطمہ کیا نوحے پڑھتی ہے کہ کلیجہ ہل ہل جاتا ہے-"

"تو اب ہولی اور دیوالی بھی مناؤ گی؟" لوگ پوچھتے-

"کیوں نہیں جی- ہمیں دیئے اچھے لگتے ہیں- اور ہولی میں اللہ قسم پچھلے سال نصیر بھیا نے ڈامرل دی تھی- اف! میری تو ساری چوٹی چپک کر جوتا ہو گئی

تھی- کئی گھنٹوں مٹی کے تیل سے اور نہ جانے کس کس سے گھسائی کی، مگر ہفتہ بھر تک بھتنیوں کی شکل لئے پھری- ساری چوٹی غارت ہو گئی-" وہ ایسے چٹخارے لے کر بیان کرتیں جیسے بھتنیوں کی سی شکل لئے پھرنا اور چوٹی غارت کروا بیٹھنا ہی مقصد زندگی ہو-

"مگر خدا کے لئے اب کرسمس کے لئے تو چندہ نہ بٹورو- کم بخت انگریزوں کا تہوار ہوے- ادھر کھدر پہ جان دیئے دیتی ہو- گاندھی جی کے چرن چھونا حاصل زندگی سمجھتی ہو اور ادھر ان کرنٹیوں کے ساتھ مل کر-----"

"اے بھائی سڑن نہ بنو- یہ موٹی کالی کلوٹیاں انگریز کہاں سے ہو گئیں؟ اپنی نورا سویٹ انگریز ہے؟ موٹی کالی بھنڈ- تم دیکھنا کتنا مزا آئے گا- سب کو پریذنٹ ملیں گے- بون فائر کے گرد بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھائیں گے-" وہ جھوم اٹھتیں-

اور کرسمس کے موقع پر عالیہ بٹیا سارے بورڈنگ کو سر پر اٹھا لیتیں- دنیا بھر کا سامان سارے محلے سے مانگ تانگ کر جوڑتیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بوکھلا لیتیں- پریذنٹ بن رہے ہیں- ہال سجایا جا رہا ہے- نشاط ہوسٹل سے لے کر میتری بھون تک گھوڑے کی چال دوڑے چلی جا رہی ہیں- کپڑوں کی پوٹلیاں لئے بگٹٹ بھاگ رہی ہیں-

"اے بھئی بے بی کرائس کے لئے پنگوڑا کتنا سڑا ہوا ہے- اللہ کوئی نئی منگوا دو- ذرا اپنے تکئے سے سینٹا کلاز کی ڈاڑھی کے لئے روئی دے دو-"

اف کبھی جی چاہتا مارے سوریا کو- مگر پھر وہ ایسے بے وقوفوں کی طرح ہنسنے لگتی کہ سارا غصہ رفوچکر ہو جاتا-

جس کا جی چاہے عالیہ بٹیا کو بے وقوف بنا کر الو سیدھا کر لے- جس کا جی چاہے پھسلا کر جو چیز چاہے مانگ لے- امتحان کے زمانے میں ساری کتابیں نوٹس اور پیپر دوسرے مانگ لے جاتے- یہ لائبریری میں کتابوں سے سر مار رہی ہیں- ایک دفعہ تو کسی کو سوال حل کر کے دیتی ہوئی پکڑی گئیں- اگر دوسری کوئی ہوتی تو اسی وقت امتحان کے ہال سے نکال باہر کی جاتی- عالیہ بٹیا نے اپنی صاف ستھری ہوئی

حیرت زدہ آنکھوں سے کچھ ایس دیکھا کہ نگرانی کرنے والی ٹیچر مسکرا کر مڑ گئی۔
عالیہ بٹیا تو باؤلی تھیں اور اس باؤلے پن کی جتنی سزا بھی انہیں ملتی کم تھی اپنی فیس لاتیں۔ مگر کوئی لڑکی بسورتی کہ منی آرڈر نہیں آیا' بڑی مصیبت ہے۔ یہ جھٹ اس کی فیس دے دیتیں۔ پتہ نہیں انہیں تنبیہہ کی جاتی تھی کہ نہیں۔ کبھی پرنسپل کے دفتر سے مونہہ لٹکائے نکلتی دیکھی نہیں گئیں۔ اور یہ نہیں کہ عالیہ بٹیا کوئی رئیس لکھ پتی کی بیٹی تھیں۔ یتیم تھیں اور ماموں کے گھر رہتی تھیں۔ وظیفوں سے تعلیم گھسٹ رہی تھی۔ دل تھا کہ معاذ اللہ۔ جیسے گنگا جمنا کا سنگم۔ کم بخت کی حماقتوں پر پیار آتا تھا۔
"رضو بٹیا نے پھر کوئی سورپن کیا' جو خالہ جان نے بلا بھیجا۔" عالیہ بٹیا پریشان ہو کر سوچنے لگیں۔
رضیہ اتنی ہی بدذات تھیں جتنی یہ بھولی تھیں۔ نہایت خود غرض' بے حد اکلوتی اور لاڈلی۔ اماں ابا کی زندگی اسہارا' دادا دادی کی آنکھوں کی ٹھنڈک' ننہیال کی لاڈوں بگاڑی' دولت کے نشے میں غرق' اور لڑکیاں تو ان سے سیدھی طرح بات کرنا بھی اپنی ہتک سمجھتی تھیں۔ مگر عالیہ بٹیا تو ان پر بھی حسب عادت ٹوٹ پڑیں۔ لوگوں نے بہت سمجھایا بجھایا خوشامدی اور چاپلوس کہا۔ خود رضیہ نے یہی سمجھا کہ وہ ان کی موٹر میں لفٹ لینے کے لئے مکھن چپڑ رہی ہیں۔ مگر وہ بھلا ماننے والی تھیں۔ کلیجہ نکال کر تھما دیا' اور بالکل بے غرض۔ مجال ہے جو موٹر میں لفٹ لے جائیں۔ وہی اپنے رکشے میں کھچڑ کھچڑ کرتی آتی جاتیں۔
"نہیں بنّو۔ کلوا غریب کیا کہے گا۔" کلوا آپ کا چہیتا رکشہ والا تھا' جس کے ہر سال وہ راکھی باندھ کر ایک روپیہ نیگ پا کر جامے سے باہر ہو جایا کرتی تھیں۔ کلوا کچھ اور پیاروں سے کم لاڈلا نہیں تھا۔ ہاں فینو درزی کی اور بات تھی۔ سارے بورڈنگ سے سلائی مانگ مانگ کر اسے دلواتی تھی۔ اس کی ایسے پبلسٹی کرتی تھیں کہ سب سمجھتے تھے کہ اس پر لٹو ہیں۔ بوڑھا ہے تو کیا ہوا یہ بھی سٹرن ہیں۔
مگر وہ لٹو کس پر نہیں تھیں؟ ان کی بوکھلاہٹوں پر غصہ آتا تھا' مگر انہیں اس

غصہ پر پیار آتا تھا۔ لشتم پشتم خالہ جان کے ہاں پہنچیں۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ رضو بٹیا کی ناک لال پکوڑا ہو رہی تھی۔ خالہ جان ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھیں۔

"علو تمہارا کہا تو بہت مانت ہے رضو تمہیں او کا سمجھاؤ۔" خالہ جان نے موہنہ بسور کر کہا۔ عالیہ بٹیا ہل گئیں۔

"او حرام جادے نادروا کے پیچھے ہلکان ہوئے رہی ہیں۔ ہم کہہ دیا ہے کہ بٹیا ہمری لاس پہ سے برات جیہئے ۔ ہم تم کا بھنگی کا دےئ دیہیں بلا۔"

"اے ہے خالہ جان---- نادر میں ایسی کون سی برائی ہے؟"

زندگی میں پہلی بار انہوں نے کسی کی عرضداشت میں عیب نکالا۔ ورنہ عادتاً انہیں خالہ جان اور نادر دونوں کی حمایت میں چکر گھنی ہو جانا چاہئے تھا۔ ان کا کلیجہ تو ہر کسی کے لئے پھٹنے لگتا تھا۔

"اے بٹیا' او نکا دوئی کوڑی کا جلاہا---- اوکی اتنی ہمت کہ ہمری بٹیا کا بہکائے کے جائداد پہ دانت نکوسے۔

یہاں عالیہ بٹیا قائل ہو گئیں۔ واقعی رضو بٹیا کی جائداد پر دانت نکوسنے کا نادر میاں کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مگر اب کیا کیا جائے؟ رضو بٹیا ایک دم دل کے ہاتھوں بے بس ہو چکی ہیں۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے۔ نادر کے لئے جان دینے کو تیار ہیں۔

"اے ہے بھئی اللہ نہ کرے۔" عالیہ نے انہیں کلیجے سے لگا کر کہا۔

"نہیں سچ علو' اب ان کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اللہ ہمیں تھوڑی سی سنکھیا لا دو۔"

حسب عادت عالیہ بٹیا کہنے والی تھیں "ابھی لو' یہ کون سی بڑی بات ہے!" مگر پھر خودکشی کا خیال آیا تو لرز اٹھیں۔ کہنے لگیں "تمہارے دشمن کھائیں سنکھیا۔ میں سمجھاتی ہوں خالہ جان کو۔"

مگر جب خالہ جان نے بھی ان سے سنکھیا لانے کی فرمائش کی تو عالیہ بٹیا کے

کلیجے پر آرے چلنے لگے۔ وہ جو کسی کے چہرے پر میل آتے دیکھ کر لرز اٹھیں۔ خودکشی کی دھمکیوں سے ادھ مری نہ ہو جائیں تو اور کیا کریں گی۔

دو تین دن تو ایسی ویران اور پراگندہ پھریں کہ ہم سب سمجھے چلو عالیہ بی کی مٹی عزیز ہو گئی۔ انہیں ضرور کسی نہایت گیان آدمی سے عشق ہو گیا ہے۔

"اے بھئی لعنت ہے عشق پر۔ یہاں پر کشتوں کے پشتے لگنے والے ہو رہے ہیں او تم لوگوں کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ مر جائے گی کم بخت رضو----" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"ارے تو شادی کر لے نادر سے۔ اس میں کیا ہے۔ وہ کوئی بچی تھوڑی ہے۔"

"تو خالہ جان مر جائیں گی۔"

"ارے ہٹاؤ کوئی نہیں مرتا۔ ارے اب تو لوگ ہیضہ طاعون کے مارے نہیں مرتے تو بے چارے عشق کی کیا بساط ہے؟"

ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ اچھا تو کہوں جا کے رضو سے؟"

"کہنا کیا؟ بس بھگوا دو اسے نادر کے ساتھ۔"

مگر جب نہایت خوشی خوشی وہ رضو بٹیا کو بھگوانے پہنچیں تو وہ پسر گئیں اور خاندان کی ناک لے دوڑیں۔ لیکن عالیہ بٹیا کوئی معمولی وکیل نہیں تھیں۔ انہوں نے رضو بٹیا کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ ایسے کہ انہیں نادر کے ساتھ بھاگنے کے سوا اور ہر شے ناممکن نظر آنے لگی۔ آخر انہوں نے دبی زبان سے اقرار کیا کہ بھاگ تو وہ بے شک جائیں مگر----

اور "مگر" نے اتنا بڑا مونہہ پھاڑ کر عالیہ بٹیا کو عجیب شش و پنج میں ڈال دیا۔ بٹیا بھاگیں تو جائداد سے قطعی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

"سو تو ہے---- مگر نادر کے لئے تو تم ہر قربانی دینے کو تیار ہو۔"

انہوں نے کج بحثی شروع کر دی۔ یہی تو عالیہ بٹیا میں خرابی تھی کہ رات کو دن کہنا شروع کریں گی تو بس اڑیل ٹٹو کی طرح کہتی ہی چلی جائیں گی۔ ان کا کیا

ہے۔ وہ ماموں کے ٹکڑوں پر پلیں۔ انہوں نے وہ سکھ کہاں جھیلے جو بے چاری رضو بٹیا کی گھٹی میں پڑ چکے تھے۔ کھری دری اور میلی توشک پر سونے والی نرم نرم گدوں کی کم بخت عادت کو کیا جانے؟ سال میں چھ جوڑوں میں گزر کرنے والی کو کیا پتہ کہ جب الماریاں کپڑوں سے اٹا اٹ ہوجاتی ہیں تو لباس کے چناؤ میں کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟ علو بٹیا کا ایک چپل پھٹ جاتا ہے تو کہیں جا کے دوسرا پہن سکتی ہیں۔ مگر وہ غریب جس کے پاس پچاس جوڑی جوتے ہوں وہی انتخاب کی مددسری کو سمجھ سکتی ہے۔

رضو بی کی مجبوریوں پر غور کر کے عالیہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں اور خالہ جان کو راضی کرنے پر جٹ گئیں کہ وہ ہنسی خوشی بیٹی کی شادی نادر سے کر کے اسے کوئی عمدہ سی نوکری دلوا دیں۔

مگر خالہ جان مردار ایک اڑیل۔ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔

"تم او کا سمجھاؤ ----"

"کس کو؟"

"او کا نادر کا سمجھاؤ کہ بٹیا کو پھانسنے کا خیال چھوڑ دے۔"

حد ہو گئی یعنی اتنی سیدھی سی بات اور علو بٹیا کو نہ سوجھی! سچ تو ہے نادر کو کیوں نہ سمجھایا جائے۔ سمجھ دار آدمی ہے ضرور سمجھ جائے گا۔

ناپتی خاک چھانتی تیرے میرے وسیلے سے ملاقات کرنے پہنچیں۔ خالہ جان کی حالت زار کا دردناک نقشہ کھینچا' مگر وہ ظالم نہ پسیجا۔ یہی کہے گیا "وہ جہالت کا زمانہ گیا جب والدین اولاد پر ظلم کیا کرتے تھے۔"

"یوں نہ کہئے۔" عالیہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ والدین اور ظلم! حالانکہ انہیں والدین سے کبھی پالا نہ پڑا تھا۔ بچپن ہی میں انہیں دونوں لاوارث چھوڑ گئے تھے۔ ایک دھندلی سی یاد باقی تھی۔ لامتناہی پیار اور شفقت کا ایک مٹا مٹا سا عکس دماغ کے کسی نرم و نازک حصہ پر اپنا داغ چھوڑ گیا تھا۔

"آپ کے والدین آپ پر سختی نہیں کرتے؟"

"والدین سختی کیسے کر سکتے ہیں؟ حالاں کہ میرے والدین جب میں ذرا سی تھی جب ہی انتقال کر گئے۔۔۔۔ ہاں بس یہی ایک ظلم انہوں نے مجھ پر کیا کہ مجھے اپنی سختیوں سے محروم کر دیا۔"

"اوہ۔۔۔۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔"

پھر بڑے جوش و خروش سے وہ رضیہ اور خالہ جان کی وکالت کرنے لگیں۔

"آپ رضیہ کی بہن ہیں؟" نادر نے پوچھا۔

"بہن ہی سمجھ لیجئے۔"

"سمجھ لینے کی بھی اچھی کہی۔ گویا آپ ہیں نہیں، تو پھر آپ کا ان سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میری کلاس میٹ ہے، بہن سے بھی بڑھ کر۔۔۔۔"

"اور ان کی اماں خالہ سے بھی بڑھ کر۔۔۔۔؟"

"جی۔"

"آپ کی کوئی سگی خالہ ہیں؟"

"جی نہیں۔۔۔۔ مگر ہوتیں تو۔۔۔۔"

"اوہ سمجھا۔۔۔۔"

"تو آپ کوشش کریں گے کہ۔"

"کہ رضیہ کو بھلا دوں؟"

"جی۔"

"ان کی احمق والدہ کی خوشنودی کے لئے۔"

"جی ہاں دوسرے۔۔۔۔ رضیہ ابھی کم سن ہے۔ اپنا برا بھلا نہیں سمجھتی۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" نادر نے کٹتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی؟" علو بٹیا بوکھلا گئیں۔ کم بخت کی کیسی گہری گہری آنکھیں تھیں جیسے دو کنویں۔ کہ آدمی ڈوبتا ہی چلا جائے۔ ہائے بے چاری رضو!"

"خالہ جان نے؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" علو بٹیا جلدی میں کہہ گئیں۔
"آپ کی کیا عمر ہو گی؟" اس نے وکیلوں جیسی جرح جاری رکھی۔
"جی؟---- مگر میری عمر سے اور رضیہ کی زندگی سے کیا واسطہ؟" وہ بڑی مستعدی سے بولیں۔
"یوں ہی میں نے پوچھا۔"
"رضیہ مجھ سے بہت چھوٹی ہے----"
"بہت چھوٹی ہے؟"
"ہاں یقیناً ہو گی۔" عالیہ نے بڑے وقار سے کہا۔
"یہی کوئی دو ڈیڑھ سال----؟"
"قطعی----"
"ہوں---- اچھا ایک بات بتائیے---- یہ آپ کی خالہ جان ہیں نا۔ وہ---- وہ آپ کی کفیل ہیں؟"
"نہیں مجھے اسکالر شپ ملتا ہے۔ اوہ آپ غلط سمجھے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں اپنے ماموں میاں کے ساتھ رہتی ہوں۔"
"وہ بھی آپ کی کسی کلاس فیلو کے باپ ہیں----"
"نہیں وہ تو میرے سگے ماموں ہیں۔"
"تو پھر جو رضیہ کو میرے چنگل سے چھڑانا چاہ ہی ہیں اس میں آپ کا کیا فائدہ ہے؟ نادر نے بدتمیزی سے پوچھا۔
"وہ میری بڑی پیاری دوست ہے۔" عالیہ بٹیا اس قسم کے تحقیر آمیز جملوں کی عادی تھیں۔ ان کے ماتھے پر شکن بھی نہ پڑی۔
"اور آپ سمجھتی ہیں کہ میں اتنا خطرناک آدمی ہوں کہ رضیہ کو میرے چنگل سے چھڑانا ثواب کا کام ہے؟" نادر کا چہرہ تمتما اٹھا۔
"جی نہیں یہ بات تو نہیں----"
"میں خطرناک نہیں؟"

"نہیں ---- توبہ کیجئے ---- آپ تو بڑے شریف آدمی ہیں۔ مگر ----"
"جی شکریہ ---- ہاں مگر ----"
"مگر یہ کہ آپ نکمے ---- اوہ سوری ----"
"کہئے کہئے تکلف کی کیا بات ہے۔" نادر نے دانت پیس کے کہا۔
"نہ کمائیں نہ دھمائیں، رضیہ کی جائداد پر ----" انہوں نے ہکلا کر سر جھکا لیا۔ کسی کو بھی سخت سست کہنے کی انہیں عادت نہ تھی۔

نادر کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے علو بٹیا کو کھری کھری سنا دیں کہ وہ خود چونکہ اوروں کی خیرات پر پلی ہیں، اس لئے انہیں سوا روپے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ اپنی طرح دوسروں کو بھی سمجھتی ہیں۔ علو بٹیا نے بالکل برا نہیں مانا۔ واقعی وہ وظیفوں کے بل بوتے پر زندہ تھیں اور وظیفے بھی ایک طرح کی خیر خیرات ہی ہوتے ہیں۔

"ہوں تو میرا اور رضیہ کا کوئی جوڑ نہیں؟" نادر پھنکارا۔
"جی نہیں ---- وہ نازوں کی پالی، عیش و عشرت کی عادی ہے۔" بڑی ڈھٹائی سے علو بٹیا ڈٹی رہیں۔

"اچھا میرا اور آپ کا تو جوڑ ہے۔" نادر کمینے پن پر اتر آیا۔ مگر بٹیا کچھ نہ سمجھیں جھٹ سے بولیں "جی ہاں، کیوں کہ میں، بقول آپ کے خیرات پر پلی ہوں۔ میرے لئے تو ماموں جان کہتے ہیں، بس کوئی شریف آدمی ----" ایک دم علو بٹیا چپ ہو گئیں۔ کیوں کہ نادر نہایت بدذاتی سے مسکرا رہا تھا۔ ہائے یہ کیا کہہ گئیں۔
"میں شریف آدمی ہوں؟" اس نے آنکھیں ترچھی کر کے پوچھا۔
"جی ----" علو بٹیا بری طرح بوکھلا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔
"پکا کافر ہے۔ رضیہ کی جن چھوٹی تو اب میرے پیچھے لگ لیا۔"
انہوں نے ایک دم لائبریری میں دکھڑا رونا شروع کیا۔ رضیہ کی جدائی میں نادر پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے انہیں دھمکی دی کہ تم نے میری کٹی کروائی ہے اب تمہیں سنبھالو۔ نہیں تو چلا میں گومتی میں۔ رضو بٹیا منیر میاں کے پکچر پوسٹ کارڈ

دیکھ دیکھ کر ہی نادر کو بھول چلی ہیں اور اب نادر علو بٹیا کا جانی دشمن ہو رہا ہے' ان کے گھر پر حملہ شروع کر دیا ہے' ماموں جان ممانی جان بجائے ڈانٹنے کے اور اس کی خاطر کرتے ہیں علو نے بہت چاہا کہ اسے نادر بھائی جان کہے مگر اس نے واضح کر دیا کہ اگر لفظ بھائی نہ استعمال کریں تو وہ موزوں رہے گا۔ ویسے یہ قاضی لوگ تو سب بھائی وائی کی دو لفظوں میں اسی تیسی کر کے رکھ دیتے ہیں اور منیر میاں ہیں کہ آنے کا نام نہیں لیتے۔ اگر یہ کچھ چیں چپڑ کرتی ہیں تو نادر دھمکاتا ہے کہ وہ پھر رضو کو ورغلانے لگے گا۔ خیر سے بٹیا کا نکاح ہو جائے پھر مردود کو دھتا بتا دی جائے گی۔ مگر وہ تو انتقام لینے پر تلا ہوا ہے اور علو بٹیا کی مٹی پلید کر کے رہے گا۔ کیوں کہ اس نے ماموں میاں کو پیغام بھی دے دیا ہے جب انہوں نے کہا لڑکی سے پوچھ کر جواب دیں گے تو نامراد بولا "میں نے ان کا عندیہ لے لیا ہے۔"

"عندیہ کا بچہ!" علو بٹیا دھاروں دھار روتی تھیں اور نادر کی جان کو کوستی تھیں۔

"بھئی یہ اچھی مصیبت ہے۔" ہم لوگ بھی ان کے ساتھ مل کر کوستے۔ یوں ایک یتیم لڑکی کی زندگی کے درپے ہونا کہاں کی انسانیت ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ رضیہ بی نے پتہ کاٹ دیا تو وہ اس بیچاری کا دشمن ہو گیا۔

دو دن علو بٹیا غائب رہیں۔ پھر جو کالج آئیں تو دیکھ کر کلیجہ مونہہ کو آنے لگا۔ پٹی ہوئی صورت' جیسے مہینوں کی بیمار' جھکی جھکی روئی ہوئی آنکھیں سر پر دوپٹہ زور سے منڈھے' لڑکیوں نے عیادت کی غرض سے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دوپٹہ سرکایا تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ مانگ قوس قزح بنی ہوئی جگمگا رہی تھی۔ مٹھیاں کھولیں تو ارمان کا خون حنا کا رنگ باندھ رہا تھا۔ اف!

"اور علو بٹیا ایک ایک کر کے گلے لگ کر سسک رہی تھیں۔

"صبر کرو علو پیاری۔" سب نے تسلی دی۔

"کیسے صبر کروں' میری بہن' اس نے تو مجھ کہیں مونہہ دکھانے کا نہ رکھا۔ ہائے خالہ جان میکا جنم میں تھوک رہی ہیں۔ اس شخص کی مکاری دیکھو' ماموں میاں

تک کو نہ بتایا کہ مڈل ایسٹ میں کوئی ڈیڑھ ہزار کی نوکری لگ گئی ہے---- منیر میاں نے اٹلی میں کسی فرنگن سے شادی کر ڈالی۔ اب خالہ جن کوس رہی ہیں کہ میں نے ان کی رضو کے منگیتر ورغلا کے خود پھانس لیا۔"

علو بٹیا ہچکیوں سے روتی رہیں اور امتحان کے بعد ان کا جانی دشمن انہیں لے کر مڈل ایسٹ کی طرف اڑ گیا۔
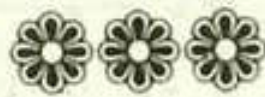
بیڑیاں

"تو یہ ہیں تمہاری قبر آپا----- لاحول ولاقوۃ وحید نے اچھا بھلا لمبا سگریٹ پھینک کر دوسرا سلگا لیا- کوئی اور وقت ہوتا تو جمیلہ اس سے بری طرح لڑتی اسے یہی بڑا لگتا تھا کہ سگریٹ سلگا لیا- ~~کوئی اور وقت ہوتا تو جمیلہ اس سے بری طرح لڑتی اسے یہی برا لگتا تھا کہ سگریٹ~~ سلگالی جائے اور پی نہ جائے بلکہ باتیں کی جائیں- جب سلگائی ہے تو پیو- دھواں بنا کر اڑا دینے سے فائدہ- مفت کی تو آتی نہیں- مگر اس وقت وہ ہنسی کو دبانے میں ایسی مشغول تھیں- کہ گھریلو اقتصادیات کا بالکل دھیان نہ رہا-

"اوئی اللہ------ کبریٰ آپا سن لیں تو------"

"ہماری بلا سے' سن لیں------ چہ چہ ------ سراسر دھوکا------ جعل یعنی ہم یہاں پیاری سی چٹاخ چٹاخ سالی کے تخیل میں گھل رہے ہیں- یار دوستوں کو ادھ مرا کر دیا ہے------ رشک کے مارے' ہٹاؤ بھی نری وہ ہو تم-"

"تو------ کیا آپ سمجھتے تھے' میں سچ مچ انہیں حسین کہتی تھی- یونہی ذرا آپ کو چھیڑنے کو کہہ دیا تھا- ہونھہ' بڑے آئے وہاں سے جیسے میری بہنیں ٹکیہائیاں ہیں جو تم سے ٹٹول کرنے آہی تو جائیں گی یہاں-"

"ارے تو کیا حرج ہے ٹٹول میں------ کھا تو نہیں جاؤں گا بابا------ ایسا تم نے کیا نگل لیا جو------ تمہاری ان قبر......"

"ہوش میں ذرا------ اترائے ہی چلے جا رہے ہیں-"

"تو پھر کیوں دیا دھوکا-"

"کس کمبخت نے دھوکا دیا آپ کو۔" جمیلہ بنی۔ حالانکہ خوب جانتی تھی۔
"ارے ہم سمجھتے تھے چلی آ رہی ہو گی رس گلے جیسی میٹھی کوئی منی سی سالی......"

"چپ رہو جی------ ہو نہ------ تو کیا برائی ہے ان میں"------
"کس میں! قبر آپا ہیں؟ کوئی نہیں بہترین جنتی قبر ہیں------ ایسی کہ بس دیکھتے ہی مرجانے کو جی چاہے۔ قبر کی آغوش میں------ واہ۔"
"میں کہتی ہوں کیا عیب ہے۔ ایسی کتارہ جیسی ناک------ اتنا سبک دہانہ------ ہاں آنکھیں نہ بہت اچھی ہیں اور نہ بہت بری۔ مگر ناک نقشہ تو------"

"یہاں ناک نقشہ کون کمبخت ناپ رہا ہے------ اور کس کمبخت نے تم سے کہا کہ ہمیں کتارہ جیسی ناک چاہئے۔ ہم کہتے ہیں۔ عورت کے چہرے پر ناک کی ضرورت ہی نہیں۔ بیکار میں حارج ہوتی ہے۔"
"توبہ! کیسے برے ہیں آپ؟"
"اور کیا؟ یہی تو تم میں خوبی ہے کہ ناک......."
"اوئی یہ چیاں جیسی ناک کمبخت------ میری ناک بھی کوئی ناک ہے۔"
"بس ٹھیک ہے، اور نہیں تو کیا پھاوڑے برابر ہوتی۔ مگر بابا یہ تمہاری بیچا بہن------ ہمیں تو صفابات ہے کچھ......"
"ہٹئے بڑے آئے بیچا کہنے والے"......
"سوکھی ہڑ! چہ توبہ------ ہمیں تو"------
"کیا؟" جمیلہ شوق سے آگے جھک گئی۔
"یہی------ کہ کیا ہو گیا ان بچاری کو؟ معلوم ہوتا ہے پڑے پڑے دیمک لگ گئی۔"
"چہ------ کوئی نہیں۔ صحت اچھی نہیں رہتی۔ رنگت جل گئی۔ رنگ ایسا انار کا دانہ تھا کہ کیا بتاؤں۔"

"اجی کبھی ہو گا اگلے وقتوں میں ----- اب تو بس نری قبر رہ گئی ہیں اور وہ بھی گھنی گھنائی -----"

"تو کوئی ایسی زیادے عمر تھوڑی ہے" -----

"نہ ہو گی مگر معلوم ہوتا ہے۔ ڈال میں لٹکے لٹکے نچڑ گئیں۔ کوئل نے ٹھونگ مار دی شاید" -----

"ہائے اللہ ----- چپ رہئے ----- کیا گندی زبان ہے کمبخت!"

"میں کہتا ہوں ایک سرے سے عورت ہی نہیں" -----

"ایں؟ ----- واہ... ا -----"

"ہاں ----- شرط بدلو' آؤ ----- ہیجڑہ ہیں ----- تمہارا کبریٰ آپا" -----

"ہائے توبہ ----- آپ نہیں مانیں گے۔"

"خدا قسم ----- سچ کہتا ہوں سونگھ کے بتا سکتا ہوں کہ....."

"میں نہیں سنتی ----- میں نہیں -----" جمیلہ کانوں میں انگلیاں ڈال کر چلانے لگی۔

"سچ ----- قبر ہیں پوری ----- اور ہمیں قبر سے ڈر لگتا ہے" -----

"میں رو دوں گی۔" کہنے سے پہلے ہی جمیلہ نے موٹے موٹے آنسو بہانا شروع کئے۔

"ارے رے ----- رو دیں ----- اچھا نہیں نہیں ----- ہماری جمو ----- بچ ----- ہماری جمو بٹیا -----"

"پھر ----- پھر آپ نے مجھے بٹی کہا۔ پتہ ہے یہ گالی ہے۔" جمیلہ آنسوؤں کی لڑیاں بکھیرتی ہوئی دہشت زدہ ہو کر چلائی۔

"ایں؟ گالی ----- کیسی گالی ----- بٹیا نہیں بٹیا سہی ----- کیوں بیٹا تو پسند ہے ----- بیٹا چاہئے؟"

"ہائے اللہ میں -----"

"رو دوں گی۔" وحید نے نقل کی۔
"مذاق کی حد ہوتی ہے ایک، کتنی دفعہ کہہ چکی ہوں کہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے بیٹی، ماں یا بہن کہہ دینے سے۔"
"ارے؟------ یہ بات ہے اور تم نے ہمیں پہلے سے بتایا بھی نہیں۔" وحید فکر مند ہو گیا۔ "اب پھر سے نکاح کرنا ہو گا------ چلو------ چلو اٹھو۔"
"میں------ میں تو مر جاؤں اللہ کرے------ نہیں جاتی------ ہٹیے۔"
"اچھا تو پھر یہیں سہی"------
"ہائے!" اچک کر جمیلہ بھاگی۔ اس سے قبل کہ وحید اٹھے وہ چبوترے پر سے دھم سے کود باورچی خانہ میں جا چوکی پر پھسکڑا مار کر گئی۔
"ہے ہے نہیں سنتی نیک بخت------ کدھر سر پیٹ کے نکل جاؤں میرے اللہ؟" ملانی بی نے سروتہ چھوڑ کر پوری طاقت سے ماتھے پر ہتھیلی ماری۔ پریشان بال، اندھوں پر دوپٹہ پھیلا، جیسے الگنی پر سکھانے کے لئے ڈال دیا ہو۔ گال دہکتے آنکھیں آنسوؤں میں نہاتی مگر ہونٹ مسکراہٹ میں مچلتے ہوئے------ جمیلہ نے لاپروائی سے چمٹا اٹھا کر چولھے کی راکھ بکھیر دی۔ جلن تھی اسے ملانی بی کی لکچر بازی سے۔ جدھر جاؤ نصیحتوں کی پوٹلیاں ساتھ، سارے گھر کی زنانی پود کی خدائے مجازی سمجھو۔ جب تک زچہ کی پٹی پر بیٹ پکڑ کر نہ بیٹھیں تو نئی روح کی مجال نہیں جو دنیا میں پر بھی مار سکے۔ کنواری بیاہی سب ہی کے مرحلے چٹکیوں میں طے کرا دیتیں۔ ممکن نہیں جو کوئی کیس بگڑ جائے------ لڑکی بالیوں کو اشارے کنایہ سے بہوؤں کے گھونگھٹ میں منہ ڈال کر اپنا سبق پڑھا ہی دیتیں۔ جونہی کوئی امیڈ سے ہوتی۔ ملانی بی اس کے گرد گھیر ڈال پنجے گاڑ کر بیٹھ جاتیں۔
"ہے ہے بنو------ اے دلہن------! اللہ کا واسطہ یہ جہاز کا جہاز پلنگ گھسیٹ رہی ہو اور جو کچھ دشمنوں کو ہو گیا تو------ سچ سچ میری لاڈلی کتنی دفعہ

کہا کنواری بیاہی ایک سماں نہیں۔ بنو وہ دولتیاں اُچھالنے کے دن گئے۔۔۔۔۔۔ بیٹی جان پنڈا سنبھال کے چنچنا گھڑا سمجھو' ٹھیس لگی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

مگر جتنے جتنے پھیرے لگائے جاتے' اتنے ہی چٹخے گھڑوں کی دراڑیں چوڑی ہوتی جاتیں۔ آج اس کے پیچ ڈھیلے تو کل اس کی کلیں خراب۔ آج ایک کے نلے اینٹھے تو کل دوسری کی ناف غائب! توبہ! کیا گھناؤنی پیچپاتی زندگی ہے کہ آئے دن کوٹھریوں میں تیل کڑکڑائے جا رہے ہیں۔ بساندی ہچلاندی چیزیں جل رہی ہیں۔ مالشوں کے گھسے چل رہے ہیں لیپ بندھ رہے ہیں۔ کیا کمبخت عورتوں کے مرض بھی...... مگر مردوں کو کون سے کم روگ لگے ہیں؟ نہ بچے جنیں' نہ خون چسائیں' پھر اللہ مارے کیوں رنجھے جاتے ہیں۔ ایک سے ایک لاجواب بیماری! بیٹے بڑے ہیں۔ دوا خانے۔۔۔۔۔۔ دواؤں سے کیسا جی کڑھتا ہے مگر جمیلہ کو تو بیر تھا ملانی بی سے کنوارپنے میں تو خیر اس نے سنا ہی نہیں ان کا کہنا مگر یہاں بھی اماں جان نے لاڈلی کی جان کو روگ کی طرح لگا دیا تھا' کمبخت اٹھتے بیٹھتے کچوکے ہی دیتیں مگر وہ انہیں جلانے کو دھما دھم کودتی۔ ایک سپاٹے میں زینے سے اتر آتی خوب احاطے میں سائیکل چلاتی۔ رسی پھلانگتی اور ملانی بی سینہ کوب لیتیں۔ وحید سے شکایت کرتیں۔۔۔۔۔ وہ اور شہہ دیتا ہے اور جب ایک محاذ پر انہیں شکست ہو جاتی تو دوسری طرف رخ کر کے حملہ کرتیں۔ یہ ان کی عادت تھی۔

"ارے بنو یہی تو دن ہیں اوڑھنے پہننے کے۔۔۔۔۔ کب سنو ہو تم"۔۔۔۔۔۔ وہ سمجھاتیں۔

"بھئی ہمارا جی ہولاتا ہے"۔۔۔۔۔۔ کس قدر جاہل تھیں ملانی بی۔۔۔۔۔۔ بھلا جب تک گال چکنے ہوں اور باہیں گدگدی ہوں تو حماقت ہے زیور لادنا۔ یہ لیپا پوتی تو جب ضروری ہوتی ہے جب عمارت ذرا دو چار برساتیں جھیل کر کچھ ادھر سے ٹپکنے لگے کچھ ادھر سے جھک جائے مگر ملانی بی کب مانتی تھیں۔ ان کا فلسفہ ہی دوسرا تھا۔ چوٹنے سے پہلے ہی کیوں نہ جھال لگا دو برتن میں! عقلمندی!

"اے بیگم دم ہولاتا ہے! کوئی تم ہی نرالی تو ہو نہیں۔۔۔۔۔۔ خیر ہمارا کیا

آپ ہی ترسو گی۔"

"کیوں ترسوں گی۔ جب جی چاہے گا پہن لوں گی۔"

"ارے چاند میرے جب بیڑیاں پڑ جائیں گی تو پھر جی بھی نہ چاہے گا۔"

"بیڑیاں؟"

"ہاں اور کیا۔ بیڑیاں ہی ہوویں ہیں ------ اب اللہ رکھے گو موت کرو گی کہ گہنا پاتا کروں گی۔"

توبہ! کیا زبان ہے ملانی بی کی جیسے کیچڑ بھری نالی۔ اور ساتھ ساتھ کیا لفنگوں جیسی آنکھیں بناتی تھیں کہ اچھا بھلا انسان جھینپ کر رہ جائے۔ اٹھتے بیٹھتے بس یہی ایک دعا تھی۔ اللہ گود ہری بھری رکھے! بیٹا ہو! گود بھرتے وقت جو سمدھنوں نے اسے دودھوں نہاتے اور پوتوں پھلنے کی دعا دینا شروع کی تو یہ دن ہو گیا ------ کسی سلام کا جواب ڈھنگ کا نہیں ملتا۔ وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ جھٹ پٹ بچہ دو۔

سانس لینا دشوار ہے۔ ادھر سہرے کے پھول کھلے اور ادھر کھٹاک سے پھل لگا اور پھر جو لگی آم کے پیڑ جیسی پھلوار، کبھی بور، کبھی آمیاں اور کبھی پت جھڑ!

وہ ایک جھپاکے سے وہاں سے بھاگی ------ اور سہم کر وحید کی آغوش میں چھپ گئی۔ وہ اس کا طرف دار تھا۔ شادی کرتا ہے انسان شوہر کے لئے، ورنہ بچے تو ویسے بھی مل سکتے ہیں اور پھر یوں بھی جب چاہو، جب انسان ہی کیا کتے، بلی، بندر جس کے بچے کو چاہو دم کے ساتھ لگا لو۔ دمہ بن جائے گا اور پھر یہی چند مہینوں کی بات ہوتی تو اور بات تھی۔ وہاں تو ساری عمر کے رنڈے گھسے اور دھونیاں لو، اور اوپر سے پلے کی پیاؤں پیاؤں!

•

اندھیرے میں اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ ڈھونڈنا چاہا مگر چکرا کر گر پڑی۔ وہ کانوں تک دھنکی ہوئی روئی کے ریشوں برابر انسانی کیڑوں کی دلدل میں دھنس گئی۔ دیکھتے دیکھتے اس کے جسم کی جاگیر پر لٹیرے ٹوٹ پڑے اور اس کے وجود

کو دیمک کی طرح چاٹ لیا۔ دو چار جوؤں کی طرح بالوں میں قلا بازیاں لگانے لگے۔ چند ایڑیاں دھمکاتے اس کی موتی جیسی آنکھوں کی جلد کو کھرچنے لگے۔ دو چار نے ہتھوڑیاں لے کر دانتوں کا کھلیان کر دیا اور دم بھر میں بھرا ہُوا منہ کھنڈر بن گیا۔ بڑے بڑے آہنی اوزار چلا کر انہوں نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کی ایک ایک گرہ جھنجھوڑ ڈالی اور وہ پچکی ہوئی مشکؔ کی طرح نیچے بیٹھ گئی۔

اس کے ہاتھ بے ست ہو گئے جیسے بجھی ہوئی لکڑیاں! وہ لمبی ناگن جیسی چوٹی کوڑھ ماری چھپکلی بن گئی۔ وہ گداز بازو جن پر وحید شرارت سے نیل ڈال کر انہیں سنگ مرمر سے تشبیہ دیا کرتا تھا۔ وہ گدگدی کے خوف سے بے چین پاؤں جنہیں وہ ڈر کر شلوار کے پائنچوں میں چھپا لیا کرتی تھی۔ اس کی دولت جس کے دبدبہ سے وہ وحید کے دل و دماغ پر راج کرتی تھی۔ نیچے ڈھے گئی جیسے طوفان اور آندھی کے زور کے آگے کچا مکان!

وحید! اس کا وحید تو تا۔ چلا چلا کر وہ اسے پکارنے لگی۔ جونکوں کا چوسا ہوا پھوگ بنگھیائی ہوئی ہڈیاں اور سکڑی ہوئی کھال کی پوری طاقتیں لگا کر اس نے وحید کو پکارا۔ اس کا حلق پھٹا ہوا تھا مگر آواز نہ تھی۔ اس جسم غفیر کے غل میں اس کی ہر چیخ فنا ہو گئی۔ وہ ابھی موجود تھے ـــــــ اس کا جسم اور روح چھوڑ لینے کے بعد وہ ہاتھوں میں لمبی لمبی جھاڑیں اور ہونٹوں پر مسرت بھری کلکاریاں لئے صفایا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چشم زدن میں اس کے جہیز کے جھلملاتے جوڑے جو اس نے دم بولانے کے ڈر سے نہیں پہنے تھے۔ آنکھوں کو خیرہ کرنے والے زیور لمبے جھمکے اور بالے انگوٹھیاں اور چندن ہار' اس کے چینی کے سیٹ اور چاندی کے ظروف ان لمبی جھاڑوؤں کے لمبے سپاٹوں میں لپٹے دور بہتے چلے جا رہے تھے......

وحید!...... اس نے پھر پکارا اور پھر اپنے سے دور اس نے اسے باد مخالف سے لڑتا ہوا پایا ـــــــ لنڈ منڈ تنہا درخت کی طرح وہ اداس اور جھکا ہوا تھا۔ اس کا چوڑے سینے والا جوان شوہر ـــــــ وہ چیخ مار کر لپٹ گئی۔

"وحید ـــــــ وحید۔"

"کیا ہے جمیلہ------ وحید نے جواب دیا- مگر وہ اس کے سینے سے لگی چیختی رہی-

"کیا خواب میں ڈر گئیں جمو؟" وحید نے اسے سمیٹ کر قریب کر لیا-

اور صبح سے اسے کسی نے ہنستے نہ دیکھا- وہ خاموش اور ڈری ہوئی کسی نامعلوم حادثے کے انتظار میں لرزاں تھی- اس کا رنگ مٹیالا ہو گیا تھا------ جیسے پڑے پڑے دیمک چاٹ رہی ہو- اس نے اپنا چالے کا بھاری پوتھ کا پاجامہ پہن ڈالا- جیسے وہ اسے چور اچکوں سے بچا ڈالنا چاہتی ہو- مگر اس کی نگاہوں کی تھکی ہوئی اداسی اور مردنی نہ گئی- چلتے چلتے ایک دم زور زور سے پیر پٹخنے لگتی- گویا کوئی بھاری سی لوہے کی رکاوٹ جھاڑ پھینکنا چاہتی ہو-

اسے وحید کے مذاق پر رونا آنے لگا----- اور جب اس نے صرف اسے ہنسانے کے لئے قبر کی آغوش میں سو جانے کی دھمکی دی تو وہ بدمزاج چڑیلوں کی طرح اس کی جان کو آگئی- اس نے صاف صاف گالیاں اور ذلیل کوسنے دینا شروع کیا کہ واقعی کبریٰ آپا پر عاشق ہے اور اسے کبریٰ آپا سے ایسی نفرت ہو گئی کہ حد نہیں- وہ مشتبہ نظروں سے ہر وقت انہیں ایک مختصر گھیرے میں لپیٹے تاکا کرتی- ان کے ہر فعل پر دل دھڑکاتی- وحید بھونچکا اسے دیکھا کرتا اور وہ ڈائنوں جیسے خوفناک جملے بکا کرتی- اس کا مزاج اور بگڑا' یہاں تک کہ رات کی نیند اور دن کا چین غائب ہو گیا- گھنٹوں کسی غیر انسانی طاقت سے سہمی ہوئی وہ خاموش آنسو بہایا کرتی-

ایک بار اس نے اپنے سب جوڑے باری باری نکالے- وہ چست پھنسی ہوئی صدریاں' تنگ کمر کے کرتے' فیشن ایبل جمپر سب دیکھے اور ٹھنڈی سانسیں بھر کر رکھ دیئے- کپڑوں کے صندوق کو قبر کے پٹ کی طرح بھیڑ کر وہ خاموش رویا کی- اسے اور بھی چپٹ لگ گئی-

مگر پھر اس نے ایک جھٹکا مارا اور چھنا چھن کرتی آہنی زنجیریں دور بکھر گئیں------ قہقہہ مارتی' کھلکھلاتی ہوئی جمیلہ موت سے کشتیاں لڑنے لگی- ملانی بی نے سر کوٹ لیا- بیگم صاحب چونڈا نہ مونڈ دیں------ ہا! بچاری کے

صدیوں کے تجربے پر پانی پھر گیا----اور جمیلہ؟
دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہلکی پھلکی تیتری کی طرح ہوا میں تحلیل ہو گئی!
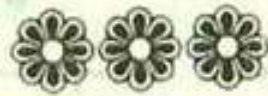
ایک شوہر کی خاطر

اور یہ سب کچھ بس ذرا سی بات پر ہوا------ مصیبت آتی ہے تو کہہ کر نہیں آتی------ پتہ نہیں وہ کون سی گھڑی تھی کہ ریل میں قدم رکھا اچھی بھلی زندگی مصیبت ہو گئی۔

بات یہ ہوئی کہ اگلے نومبر میں جودھ پور سے بمبئی آ رہی تھی سب نے کہا------!

"دیکھو پچھتاؤ گی مت جاؤ------" مگر جب چیونٹی کے پر نکلتے ہیں تو موت ہی آتی ہے!

سفر لمبا اور ریل زیادہ ہلنے والی نیند دور اور ریت میں جھپاکے اوپر سے تنہائی سارا کا سارا ڈبہ خالی پڑا تھا۔ جیسے قبرستان میں لمبی لمبی قبریں ہوں------!

دل گھبرانے لگا۔

اخبار پڑھتے پڑھتے تنگ آ گئی۔ دوسرا لیا------ اس میں بھی وہی خبریں!

دل ٹوٹ گیا۔

کاش میں قبرستان میں ہوتی۔ بلا سے مردے ہی نکل پڑتے۔ بچوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہول رہا تھا------ "کاش کوئی آ جائے------ کاش کاش------ میں نے دعا مانگنی شروع کی۔

ایک دم سے ریل جو رکی------ تو ایک دم سے جیسے بٹریاں ٹوٹ پڑیں۔ انسان تو کم آئے بچے اور بچیاں زیادہ۔ بچے ایسے جو قحط زدہ گاؤں سے آ رہے تھے۔ کہ آتے ہی خوراک پر پل پڑے------ دودھ پینے والوں کو تو خیر سارا معاملہ مل

گیا اور وہ جٹ گئے۔ باقی کے تلملانے اور تڑپنے لگے:۔

پوٹلیاں اس قدر بے ہنگم اور فضول جگہ گھیرنے والی وضع سے بندھی تھیں۔ کہ کسی کل بیٹھتی ہی نہ تھیں۔ ایک سنبھالی تو دوسری تیار۔

میں علیحدہ پٹڑی پر اس زاویئے سے بیٹھتی تھی۔ کہ اگر گٹھڑی گرے تو میری ریڑھ کی ہڈی بچ جائے۔ مجھے اپنے جسم میں ریڑھ کی ہڈی سب سے زیادہ عزیز ہے----- کہتے ہیں ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی لوتھڑا ہو جاتا ہے۔

"کہاں جا رہی ہو-----"

بیچاری ہمسفر نے گٹھڑیوں کی طرف سے غیر مطمئن ہوتے ہوئے بھی نہایت فکر مند ہو کر پوچھا۔

"میں نے جلدی سے بتایا اور پھر ان کی توجہ اس وزنی گٹھڑی کی طرف مفطفر کی جو شائد برتنوں کی تھی اور ذرا سی ٹھیس سے گرنے کو یار تھی۔ اگر اتفاقیہ ذرا ہاتھ لگ جاتا تو برتن اس تیزی سے آپس میں ٹکراتے کہ جی گھبرا اٹھتا-----!

"کہاں سے آ رہی ہو-----"

میں نے ذرا کم مستعدی سے بتایا۔

"میکے جا رہی ہو-----" جب تک شادی نہ ہوئی ہو تب تک جگت میں ہی ہے۔ اور کہیں بھی نہیں۔ یعنی میکہ اور سسرال کا سوال ہی نہیں، لہٰذا میں چکراتی-----!

سوچا اندازا" کس صوبہ میں شادی ہونے کا خطرہ ہے۔

"میاں کے پاس جا رہی ہو-----"

"نہیں-----" میں نے چاہا موضوع بدل جاتا تو اچھا ہوتا خواہ مخواہ کون ہمدردی وصول کرے-----"

"تو پھر سسرال جا رہی ہو گی-----؟"

کیوں----- ذرا ان سوالوں کے جواب بہت فلسفیانہ ہوتے ہیں۔

"نہیں تو----- میں بمبئی جا رہی ہوں----- شادی----- شادی تو

نہیں ہوئی-----"

میں نے ذرا دل میں کچھ حقیر ہو کر کہا۔

حالانکہ شادی کے خلاف کالج کے مباحثہ میں مجھے اول انعام ملا تھا۔ اور اب بھی----- خیر اب تو----- ہاں تو میں نے کہا۔ وہ متحیر ہو کر اتنی زور سے اچھلیں کہ بچے کے منہ سے دودھ چھوٹ گیا۔

اور وہ مذبوحہ بکری کی طرح چیخا----- میں نے دھیان بٹانے کو ان کی توجہ بچے کی طرف کرنا چاہی۔ مگر وہ ٹٹول ٹٹول کر بچے کی ناک میں دودھ ٹھونسنے لگی۔ اور میں یہاں لکھنا نہیں چاہتی کہ مجھے انہوں نے کس رحم اور مہربان سی نظروں سے دیکھا۔

انہیں مجھ پر محبت سی آنے لگی----- اور میں ڈری----- کہ کہیں وہ مجھے چمٹا کر رو نہ پڑیں----- ان کا دل بہلانے کے لئے میں نے چنے والے کو بلوایا۔ مگر وہ ایسی ہی اداس رہیں!

انہوں نے مجھے دو ایک داؤں پیچ ایک اچھا سا شوہر پھانسنے کے بتائے۔ جو بعد میں تجربہ سے قطعی بے کار ثابت ہوئے۔

میری دعا شائد ضرورت سے زیادہ قبول ہو گئی----- یا شائد مری خدا کے حضور میں کاتبین کی غلطی سے دوبارہ عرضی پیش ہو گئی۔ کہ ایک فوج انسانوں کی پھر آئی اس فوج میں بڑے بڑے ریشمی برقعے اور چھتریاں زائد تعداد میں تھیں۔

ان کے ساتھ گنے بھی تھے جن کے ٹکڑے ناپ ناپ کر اتنے بڑے کاٹے گئے تھے کہ ریل کے کسی کونے میں ٹھیک سے نہ رکھے جا سکیں۔

ان کے بستر اور صندوق بھی کچھ ایسے تھے۔ جو کسی پٹڑی کے اوپر یا نیچے کسی انداز سے بھی نہ ہو!

ان بیویوں نے آتے ہی ریل میں ہلچل مچا دی صندوق اور پلندے گھسیٹ کر تباہ کر دیئے۔ پہلے والی مسافرہ کی ضدی پوٹلیاں جو شائد ناک میں تھیں بچوں اور عورتوں پر گریں۔

"اور وہ سب ایک دوسرے پر گرے۔"
"کہاں جا رہی ہو-----"
وہ بھی کچھ پریشان تھیں-----!
بتایا-----
"کہاں سے آ رہی ہو-----؟"
"بولیں۔ حالانکہ ابھی ٹھیک سے جمی بھی نہ تھیں۔"
"برقعہ پھانسی لگا رہا تھا۔ مگر بتایا۔"
"میکے جا رہی ہو یا سسرال-----"
"کاش مجھے معلوم ہوتا۔ مگر چوکنے کا موقعہ نہ تھا۔ سسرال-----"
"ایسے کہا کہ وہ ہم سفر جو پہلے جرح کر چکی تھیں نہ سن پائیں۔"
"کیا کرتے ہیں میاں-----"
"اب میں نے سوچا کچھ تو کرتے ہی ہوں گے----- بیکار تو کاہے کو پھرتے ہوں گے-----"
"مگر کاش وہ مجھے بھی یہ بتا دیتے تو اچھا ہی تھا----- بہرحال نکھٹو تو نہ ہوں گے پر-----"
وہ خود ہی بولیں۔
"ریلوے میں ہیں-----"
"ہاں----- ہاں-----" میں نے پرشوق لہجے سے انہیں یقین دلایا۔ یہ ٹھیک رہا۔ میں نے سوچا ریلوے کا آدمی خوب رہے گا۔ مزے سے مفت کے ٹکٹ تو ملیں گے----- ہندوستان بھر میں گھوم لو----- اور مجھے تو وردی بھی ان کمبختوں کی پسند ہے۔
خصوصاً" وہ ٹوپی اور سلیٹی لال ہری جھنڈی----- اچھا ہی ہوا جو یہ بے چاری مل گئیں----- ورنہ اپنے کو تو کبھی گارڈ----- بابو وغیرہ کا خیال بھی نہ آیا۔

"اے ہاں سچ تو ہے۔"

"کون کام پہ ہیں۔ وہ ریل میں۔"

"کسی ٹھیک ہی کام پر ہوں گے ----- اور کیا -----" مجھے خیال ہی نہ آیا کہ گارڈ بابو کی بیوی بننا آسان ہے ----- مگر یہ تفصیل تو ذرا بھاری خوراک ہے۔

"پھر بھی ----- کیا کام کرتے ہیں -----" ریل میں تو ہزار سے زائد کام ہیں -----"

"اے ----- سیٹی ----- قلی -----" میں ایسی بولائی کہ کچھ بن نہ پڑا سامنے ایک قلی بڑا سا بنڈل ایک بستر آدھی درجن صراحیوں کی سیڑھی اور دو لوٹے لئے چلا آ رہا تھا۔

اور ایسے بن رہا تھا جیسے بہت بھاری ہیں۔

"قلی ----- تمہارا میاں قلی ہے -----"

حیرت کا دورہ ان پر بھی پڑا۔

میں چاہتی تھی ذرا ہم آہستہ آہستہ گفتگو کریں ورنہ کہیں پہلی ہم سفر نہ سن لیں -----

ان کا بچہ سکون سے دودھ پی رہا تھا۔ مگر ایک دفعہ بات منہ سے نکل جائے تو. پھر میں بھی اس پر ہی جم جاتی ہوں اور یہاں تو جینے کے لالے پڑے تھے۔

"ہاں ----- آں قلی ہی سہی پھر تمہیں کیا -----"

میں نے ذرا برا مان کر کہا۔

"تمہارا ----- میں ----- میاں قلی -----"

"ہاں پھر ----- تم کیوں جلو ----- تمہارا جی چاہے تم بھی* قلی سے کر لو -----!"

دس قلیوں سے کرو ----- کون روکتا ہے ----- اتنے سستے ہیں قلی۔ مگر میں ذرا چپ رہی۔ اور مظلوم سی صورت بنا لی -----!

"بولیں-----!"

"کیسے ہو گئی تمہاری شادی قلی سے-----"

پھر سوچنے لگی قلیوں سے کس طرح شادیاں ہوتی ہیں میں نے چاہا دل سے کچھ گڑھوں کسی قلی کی شادی کا حال-----"

مگر وہ اس قدر غیر دلچسپ معلوم ہوا۔

پھر میں نے کہا۔

"ایک قلی تھا-----"

"انوں نے توجہ سے سنا-----"

"وہ رہا کرتا تھا-----" میں چاہتی تھی وہ میری ہر بات پر ہوں کریں یا کم از کم سرہلائیں-----"

"پھر کیا ہوا کہ ایک دن-----کہ-----" کاش مجھے معلوم ہوتا اس وقت کوئی بھی قصہ تو یاد نہ آیا۔

"وہ لے جا رہا تھا سامان-----میں نے چاہا وہ پوچھیں۔

"کس کا-----"

اور انہوں نے پوچھا:۔

"ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی کا-----پھر وہ لڑکی-----وہ لڑکی عاشق ہو گئی۔

"کون لڑکی-----" ارے یہ تو معلوم ہی نہیں پڑا-----خیر کیا مضائقہ ہے کوئی بات نہیں-----"

"یقیناً ہو گی ہی کوئی نہ کوئی لڑکی-----کوئی خوبصورت سی ہی لڑکی ہو گی۔"

"تو وہ قلی پہ کیوں عاشق ہو گی-----!"

"وہ عاشق یوں ہو گئی کہ-----کہ-----ارے بھائی اب یہ کیا معلوم کوئی توجہ ہے ہی عاشق ہونے کی-----!"

"وہ مسکرایا ہو گا۔ اسے دیکھ کر۔۔۔۔۔"

اتنے میں ایک نہایت بھیانک قسم کا بابو مجھے دیکھ کر مسکرایا اور میں ڈری کہ کہیں سچ مچ عاشق نہ ہونا پڑے۔۔۔۔۔ ابھی انٹرویو میں جانا ہے سنے ہیں کہ عشق میں بڑی خراب حالت ہو جاتی ہے۔ بھلا پردیس میں کہاں عاشق ہوتی پھروں گی۔۔۔۔۔ ویسے یہ جسیم بھائی کے ہاں جاتا ہے اور وہ ہیضہ کے بعد بس عشق سے گھبراتے ہیں۔۔۔۔۔ خیریات گئی گزری ہو گئی۔

"اے بہن۔ یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔۔۔؟ کون لڑکی کس کا عشق میں کہتی ہوں تمہاری شادی کیسے ہوئی۔۔۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔۔۔ ان بے چاری کی شادی نہیں ہوئی۔۔۔۔۔"

آخر کو پہلی مسافرہ کو پتہ چل ہی گیا نا۔۔۔۔۔!

کتنا مردوی سے کہا آہستہ بول۔۔۔۔۔ آہستہ مگر۔۔۔۔۔ یہ لیجئے وہ قلی بھی ہاتھ سے گیا۔

"جب نہیں ہوئی تھی۔۔۔۔۔"

"میں نے چاہا۔ شاید مان جائیں۔۔۔۔۔"

"ہوئی۔۔۔۔۔ کیا ریل میں بیٹھے بیٹھے ہو گئی۔۔۔۔۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔۔۔۔۔ کاش گرم گرم چائے کی بجائے لوگ امیر امیر کماؤ شوہر بیچتے ہوتے تو سفر کے لئے تو میں ضرور لے لیتی۔۔۔۔۔!

پھر چاہے۔۔۔۔۔ پھر دیکھا جاتا۔۔۔۔۔!

اور میں نے ارادہ کر لیا کہ اب کہ ایک مناسب قسم کا میاں ڈھونڈنا چاہئے۔۔۔۔۔؟

ایسا اس میں کیا ٹوٹا ہے اپنا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہی رہے گا۔ بلا سے ہر مسافر سے نئے نئے جھوٹ تو نہ بولنے پڑیں گے۔۔۔۔۔

"بھئی کسی نے پوچھا۔۔۔۔۔ "حاضر میاں۔۔۔۔۔؟"

"ارے بھئی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔۔۔۔۔"

وہ میرے مستقبل سے ناامید ہو کر بولیں۔

"موٹر مانگتے ہیں----- گاڑی گھوڑا دو----- اور کبھی کماؤں جبھی نا---پُ ایسے ملے جاتے ہیں کماؤ لڑکے-----"

میں رنجیدہ ہو گئی۔

آخر یہ لڑکے کماؤ کیوں نہیں ہوتے----- کمبخت اچھے لڑکے پہلے زمانے میں کتنے ہوتے تھے۔

مولی گاجر کی طرح۔

پر اب چاہو کہ آنکھ میں لگانے کے لئے اچھا لڑکا مل جائے تو نہیں اس لڑائی نے تو اجاڑ کر رکھ دیا۔

چلو بھئی----- پہلے لڑکے تو تھے کماؤ ! نکٹو پر اب تو جسے دیکھو لڑائی پر چلا جا رہا ہے۔

"لو صاحب یہاں تو بیویاں طعنے دے رہی ہیں۔ اور لڑکے ہیں کہ مرنے کٹنے پر تلے ہوئے ہیں------"

"تم پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں-----"

ایک بولیں۔

"جیسے آپ کی مرضی-----"

میں نے اس معصوم لڑکی کی طرح کہا۔

"جس سے والدین شادی طے کرنے کے بعد روشن خیال بننے کے لئے رائے دیتے ہیں۔"

"کب کرو گی پھر اب نہیں کرو گی تو-----"

"اب----- یعنی ابھی----- میرے خیال میں----- تو----- اگر جنکشن تک ٹھہر جاتے تو اچھا تھا-----!"

"کیا-----؟"

"یہی کہ----- جب آپ کی مرضی ہے تو پھر کیوں اس نیک کام میں دیر

کی جائے------!"

"کیسا نیک کام------ کیا کہہ رہی ہے لڑکی------؟"

بہت ہی گھبرا گئیں۔

"میں نے پوچھا------ بھئی شادی کیوں نہیں کرتیں تم------"

دوسری بولیں۔

"تم کیوں نہیں کرتیں شادی------"

"بس------" میں اب کافی جل اٹھی تھی۔ حالانکہ ان کا بچہ مسلسل دودھ پی رہا تھا------!

مگر میں نے اسے نظرانداز کر دیا۔

"اوئی------ معلوم ہوتا ہے کچھ دماغ بھی خراب ہے۔"

وہ بچہ کو اور واضح طور پر لائیں تاکہ یہ نہ معلوم ہو کہ وہ صرف گود میں سو رہا ہے۔"

تو------ اچھا------ تمہاری شادی ہو گئی ہے------ کب کی تم نے شادی------؟"

میں نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ہمارے ماں باپ نے کی ہماری شادی------ ہم بھلا خود ہی کیوں کرتے------"

"تو آپ شادی کے خلاف ہیں------ ٹھیک ہے------ بالکل ٹھیک------ میرے بھی ماں باپ نے شادی کی------ جاہل انسان------!"

"اس کے بعد وہ کچھ مکدر سی ہو گئیں اور غمگین ہو کر ناشتہ دان میں سے امرتیاں نکال کر غم غلط کرنے لگیں۔"

"اے خدا------ تو جب دعائیں قبول کرنے پر آتا ہے تو یوں دعا قبول کرتا ہے------ تیرے بندوں کو کسی کل چین نہیں------ یہ تیری ناچیز بندی تنہا تھی------!"

اس نے دوسرا ہٹ چاہی تو تو نے یوں کی عذاب کی طرح مسافر نازل کرنا شروع کر دیئے۔ اور مسافروں سے زیادہ اسباب دیسے۔ بھئی ہمیں کیا حق کہ بے بات تیری مصلحت میں دخیل ہوں۔

مگر پروردگار اتنا تو سوچا ہوتا تو انسانوں میں جتنی تو نے برداشت دی ہے۔ اتنا ہی بوجھ لاد---- کہتے ہیں ہم تو بس:۔

اور میں دل میں ڈری کہ اگر دعاؤں کے قبول ہونے کا یہی ڈھنگ رہا---- تو کہیں وہ شوہر کے لئے جو ابھی ابھی دعا مانگی تھی اس کا بھی کچھ ایسا ہی قصہ نہ ہو جائے اور لے چلا چل ایک پہ ایک---- میرا تو دم ٹوٹ جائے گا۔

میں ایک ہی قمیض میں بٹن لگا دوں اور چائے بنا دوں---- تو بہت جانو---- مجھ سے بھلا اتنے کاہے کو جھیلے جائیں گے۔ ست مٹی ویسے ہی ہوں۔ اب اتنے میاؤں کو کون میرے بیٹھ کے بھگتے گا۔

کہتے ہیں کہ ڈاک خانہ میں اگر بھولے سے کوئی غلط خط پڑھا جائے تو تھوڑی سی رشوت لے کر واپس لے سکتے ہیں----

کاش دعاؤں کے معاملے میں بھی کچھ ایسا ہی انتظام ہوتا---- مگر دعا ایک دفعہ مانگی جا چکی تھی اور پے در پے قبول ہو رہی تھی۔

نئی ہم سفر بہت ہی خلیل معلوم ہوتی تھیں اور ضرورت سے زیادہ رقیق القلب، کچھ سازک سی شاعرانہ بیماری----!

کچھ آہستہ بولنے کی عادی---- مجھے ان پر بے بات پیار آنے لگا----!

"حیدر آباد جا رہی ہیں آپ----؟"

انہوں نے بڑے وثوق سے پوچھا۔

"میں ڈری کہ انکار کروں گی تو خفا ہو جائیں گی---- لہذا بڑی عاجزی سے انکار کیا اور بتایا کہ بمبئی جا رہی ہوں----"

"احمد آباد سے آئی ہوں گی----"

کس ہوشیاری سے وہ پرانی بوتلوں میں نئی دوا بھر بھر کر سر سہلا سہلا کر پلا رہی تھیں مگر ان کا چہرہ اس قدر زویا ہوا تھا- کہ دل دکھانے کی ہمت نہ پڑی-----!

میں نے بتایا-

"پڑھتی ہیں وہاں-----"

"جی نہیں- انٹرویو کے لئے جا رہی ہوں-"

"میرے ایک چچا کے سالے کی خالہ بھی بمبئی میں رہتی ہیں----- ان سے ملئے گا-----"

میں نے وعدہ کر لیا----- بھلا میں کہاں ان کے چچا کے سالے کی خالاؤں کو ڈھونڈتی پھرتی-"

"وہاں آپ کے والد والدہ ہیں-----"

"نہیں----- میرے......"

بولنے ہی نہ دیا خود بولیں-

"اچھا آپ کے شوہر ہوں گے-----"

گھن-----! وہ دیکھئے گھما پھرا کر وہی ایک ٹانگ مرغے کی' شوہر' شوہر-----!

ہندوستان کے شوہر اس قدر مرکھنے----- ٹانگیں کاٹ لیں طلاقیں دے دیں بڑی مشکل سے ملیں----- اور ملیں تو نکھٹو----- رنڈی بازی کریں جوا کھیلیں----- مگر بیویاں ہیں کہ واری جا رہی ہیں----- جسے دیکھئے اپنے یا پرائے شوہر کا رونا رو رہی ہے-

کنواریاں ہیں تو شوہر کے گیت گا رہی ہیں----- بیاہیاں ہیں تو پریتم پر فدا-----!

اور یہ پریتم کتے خون تھکوائے دے رہے ہیں----- ان مظالم معشوقانہ پر تو یہ حال ہے اگر ذرا لاڈ کر لیتے تو نہ جانے کیا ہوتا----- میں نے سوچا میاؤں

کے ظلم میں بھی کچھ مصلحت ہے۔

"کہاں رہتی ہیں آپ----- بمبئی میں----- کتنے بچے ہیں آپ کے میں تو سوچ میں پڑی تھی-----!"

اور پھر وہ میاں کے بعد بچوں کی تعداد پر اتر آئیں-----!

"آٹھ-----"

میں نے پلیٹ فارم پر تختے گنتے ہوئے کہا----- یہ ریلوں کے ساتھ مسافروں سے زیادہ کتے کہاں سے آتے ہیں۔"

"آٹھ-----؟"

"ہاں----- کیوں آپ کیوں برا مانتی ہیں----- یقین نہ آئے تو اتر کر گن لیجئے-----"

"اب میں راستہ میں کیسے اتروں----- ہاں انشاء اللہ کبھی اگر آنا ہوا میرے چچا کے سالے کی خالہ کے یہاں تو----- خیر----- مگر بہن معلوم نہیں ہوتا منہ سے-----"

"منہ سے معلوم ہی کیا ہوتا ہے-----"

"میں نے فلسفیوں کے سے انداز میں کہا۔

"جب دنیا سے مجھے نفرت ہونے لگتی ہے اور ہر چیز نیم مردہ اور اداس لگنے لگتی ہے تو میرے دماغ میں فلسفہ بھرنے لگتا ہے-----!"

"شادی کو کتنے برس ہوئے-----"

انہوں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"چار برس تین مہینے اور-----"

"اور آٹھ بچے----- اے بہن میں سمجھی تھی----- چلو ہوں گے----- مگر-----"

وہ بہت غمزدہ سی ہو گئیں۔

مجھے رحم آگیا----- مگر میں نے تہیہ کر لیا کہ کچھ ہو جائے اب اور نہیں

دلوں گی----- ورنہ بچوں کے بعد یہ نواسے اور پوتے بھی میرے ہی سر منڈھ دیں گی-----!

اور وہ بیویاں جو میرے حال زار سے واقف ہیں-----!

میں اونگھ نہ چکیں----- پھر خواہ مخواہ کی لے دے پڑے گی- آٹھ بچے سے ویسے ہی روح قبض ہوئی جا رہی تھی-

"ہاں ہاں کہتی تو ہوں----- آٹھ-----"

"ماشاء اللہ سب زندہ ہیں----- مگر بہن یہ ہوئے کیسے؟"

"کیسے ہوتے ہیں جیسے دنیا جہان میں ہوتے ہیں----- ویسے ہی ہوئے ہو گے-----"

"میرا مطلب ہے چار سال میں-----"

"ہاں میں سمجھی----- اچھا یہ معلوم کرنا چاہتی ہیں آپ تو----- یہ ہوا کہ کبھی دو کبھی تین----- اور-----!"

"ہے ہے-----" وہ لرزیں-

اور مجھے برا لگا-

"آخر یہ کون ہوتی ہیں برا ماننے والی-----" یہ میرا ذاتی معاملہ ہے----- آخر انہیں کیا----- چاہے کوئی ایک بچہ دے چاہے دس-----!"

وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا:-

پچھلی ملاقاتیں جاگ اٹھیں-----!

"سنا بہن-----! ان کے دو دو تین ساتھ ہوئے----- بچے-----!"

انہوں نے شکایت کی-----!

اور وہ گھبرا کر اپنے بچے گننے لگیں-

کیونکہ سوائے بچوں کے انہوں نے کچھ نہیں سنا-

"کیا قصہ ہے-----؟"

دوسری بولیں۔

جب معاملہ خوب سمجھا دیا گیا تو تینوں بگڑ کھڑی ہوئیں۔

"ابھی کہتی تھیں شادی نہیں ہوئی----- اور ابھی دو دو تین تین بچے ہونے لگے-----"

ایک نے ڈانٹا۔

"میری کیوں نہ ہوتی شادی خدا نہ کرے----- تمہاری ہی نہیں ہوئی ہو گی-----"

بات بگڑنے لگی-----!

پاس سے ایک ٹکٹ چیکر گزرے----- یا جانے کون تھے مجھے تو ہر ریل کا نوکر ٹکٹ چیکر ہی سا لگتا ہے۔ میں نے جھک کر ان سے وقت پوچھا وہ بتانے کے بعد مسکرانے لگے۔

اور پھر مسکراتے ہوئے چل دیئے۔

"تم تو کہتی تھیں اکیلی جا رہی ہوں----- اور یہ تمہارے-----"

"یہ میرا نواسہ ہے-----"

قبل اس کے کہ وہ کوئی رومینٹک سا رشتہ قائم کر لیتیں میں نے خود ہی اپنے لئے فیصلہ کر لیا۔

"نواسہ-----"

تینوں چیخیں۔

"یا اللہ----- یہ آج ان لوگوں کو مجھ سے کہاں کا بیر پڑ گیا تھا کہ میرے کنبے کے ہر فرد کے ذکر پر بن بن کر چونک رہی تھیں۔

"کیا کہتی ہے لڑکی----- یہ تیرا نواسہ ہے-----"

"تو آپ کو کیا-----؟"

"بہن بال تو سفید رکھے تھے ان کے-----"

دوسری بولیں-----

”نزلہ سے ہو گئے ہوں گے-----“

میں بڑبڑائی۔

اور پھر میں بالکل کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی----- خودکشی کو دل نہ چاہا چلتی ریل سے اترنے کی پریکٹس نہ کی----- زمین سخت----- اور آسمان دور-----!

ہونہار بات ہوکررہتی ہے----- جب زائد سامان تلوا کر بلٹی دینے لگا۔ تو کلرک نے کہا۔

”آپ کا نام----- شوہر کا نام-----“

”چغد-----“

میں نے دانت پیس کر کہا۔

”چوکھے-----؟ کیا اونڈا نام ہے-----؟“

اس نے متعجب ہو کر کلرک کے کہنی ماری۔

”یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جب اس نے مجھے مسز چوکھے بنا کر رسید دی تو میں نے اس کے منہ پر اپنا بٹوہ مع ایک عدد موٹی کتاب کے کھینچ مارا اور یہ سب کچھ ہوا سب ایک شوہر کی خاطر-----!

❀❀❀

ساس

سورج کچھ ایسے زاویہ پر پہنچ گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ چھ سات سورج ہیں جو تاک تاک کر بڑھیا کے گھر میں ہی گرمی اور روشنی پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں تین دفعہ کھٹولی دھوپ کے رخ سے گھسیٹی اور اے لو وہ پھر پیروں پر دھوپ اور جو ذرا اونگھنے کی کوشش کی تو دھما دھم اور ٹھٹوں کی آواز چھت پر سے آئی۔

"خدا غارت کرے پیاروں پیٹی کو-----" ساس نے بے حیا بہو کو کوسا جو محلے کے چھوکروں کے سنگ چھت پر آنکھ مچولی اور کبڈی اڑا رہی ہے۔

دنیا میں ایسی بہوئیں ہوں تو کوئی کاہے کو جیئے-----اے لو دوپہر ہوئی اور لاڈو چڑھ گئیں کوٹھے پر، ذرا ذرا سے چھوکرے اور چھوکریوں کا دل آن پہنچا پھر کیا مجال ہے جو کوئی آنکھ جھپکا سکے۔

بہو......ق......" بڑھیا نے بلغم بھرے حلق کو کھڑکھڑا کر کہا-----اری او-----بہو!"

"جی آئی-----" بہو نے بہت سی آوازوں کے جواب میں کہا اور پھر وہی دھما دھم جیسے کھوپڑی پر بھوت ناچ رہے ہوں-----"

"ارے تو آچک-----خدا سمجھے تجھے-----" اور دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سیڑھیوں پر سے اتری اور اس کے پیچھے کتوں کی ٹولی۔ ننگے آدھے ننگے چیچک منہ داغ۔ ناکیں سڑسڑاتے کوئی پون درجن بچے کھی کھی-----کھوں کھوں کھی کھی۔ سب کے سب کھمبوں کی آڑ میں شرما شرما کر ہنسنے لگے۔

"الٰہی۔ یا تو ان حرامی پلوں کو موت دے دے یا میری مٹی عزیز کر لے نہ

جانے یہ اٹھائی گیرے کہاں سے مرنے کو آ جاتے ہیں----- چھوڑ دیئے ہیں جن جن کے ہماری چھاتی پر مونگ دلنے کو----- اور نہ جانے کیا کیا----- پر بچے مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کو گھونسے دکھاتے رہے۔

"میں کہتی ہوں تمہارے گھروں میں کیا آگ لگ گئی ہے----- جو"

"واہ----- تم تو مر گئی تھیں-----" بہو نے بشریا کے کہنی کا ٹھوکہ دے کر کہا۔

بڑھیا جملے کو اپنی طرف مخاطب سمجھ کر تلملا اٹھی۔

"جھاڑو پھیروں تیری صورت پر مریں تیرے ہوتے سوتے تیرے......"

"ماں----- ہم تمہیں کب کہہ رہے تھے-----" بہو نے لاڈ سے ٹھنک کر کہا۔

مگر بڑھیا کوسے گئی اور بچوں کو تو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بیچاروں کو منہ چڑھاتے بھاگتے ہی بنی اور بہو پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔

دنیا جہاں میں کسی کی بہو بیٹیاں یوں لونڈوں کے ساتھ کڈکڈے لگاتی ہوں گی دن ہے تو لونڈھیارا' رات ہے تو...... ساس تو زندگی سے تنگ تھی۔

"غن غن----- غن غن-----" بہو منمنائی۔

اور طوطے کے پنجرے میں پنکھے میں سے تنکے نکال نکال کر ڈالنے لگی! ٹیں، ٹیں----- طوطا چنگھاڑا۔

"خاک پڑی اب یہ طوطے کو کیوں کھائے لیتی ہے۔" ساس غرائی۔

"تو یہ بولتا کیوں نہیں-----" بہو نے جواب دیا۔

"تیری بلا سے نہیں بولتا----- تیرے باپ کا کھاتا ہے-----" ساس نے پہلو بدل کر کہا۔

"ہم تو اسے بلائیں گے-----"

بہو نے اٹھلا کر طوطے کے پنجے میں تنکا کونچ کر کہا۔

"آئیں----- آئیں----- اے میں کہتی ہوں تیرا پتا ہی پگھل گیا ہے

اب ہٹتی ہے وہاں سے کہ لگاؤں-----" بڑھیا نے دھمکی آمیز پہلو بدل کر کہا اور جب بہو نے اور سنگایا تو کٹھالی کی شکل کی جوتی اٹھا کر ایسی تاک کر ماری کہ وہ گھڑونچی کے نیچے سوئے ہوئے کتے کے لگی- جو بلبلا کر بھاگا- اور بہو کھلکھلا کر ہنسنے لگی- بڑھیا نے دوسری جوتی سنبھالی اور بہو کھمبے کی آڑ میں-

"آنے دے اصغر کے بچہ کو-----"

"بچہ-----" بہو کو بچے کے نام پر بجائے شرمانے کے ہنسی دبانا پڑی-

"تھو ہے تیرے جنم پر----- اے اور کیا----- بچہ بھی آج کو ہو جاتا جو کوئی بھاگوان آئی/ جس دن سے قدم دھرا گھر کا گھروا ہو گیا-"

بہو اور مسکرائی اور طوطے کا پنجرہ جھکول ڈالا-

"میں کہتی ہوں یہ طوطے کی جان کو کیوں آ گئی ہے-"

"تو یہ بولتا کیوں نہیں----- ہم تو اسے بلائیں گے-"

بڑھیا جل کر کوئلہ ہو گئی----- "یہی ڈھنگ رہے تو اللہ جانتا ہے کہ دوسری نہ لاؤں تو نام نہیں-----"

دھوپ ڈھل کر گھڑونچی اور وہاں سے کنڈیلی پر پہنچی-

ساس بڑبڑاتی رہی----- موئے نفقتیے بیٹی کو کیا جہیز دیا تھا- اے واہ قربان جائیے----- خولی کپڑے اور ملمع کی بالیاں اور......

"تو ہم کیا کریں-----" بہو پھوہڑپنے سے بڑبڑائی اور کھٹولی پر پسر کر لیٹ گئی-

"اور وہ ایلومونیم کے........" جمائی لے کر بڑھیا نے پٹاری پر سر رکھ کر ذرا ٹانگیں پھیلا کر کہا- اور پھر سونے سے پہلے وہ سمدھنوں کے گھٹنوں پر سے گھسے ہوئے گلبدن کے پاجاموں، پھیکے زردے اور گھنے ہوئے پایوں والے جہیز کے پلنگ کا ذکر کرتی رہی مگر بے حیا بہو آدھی کھٹولی اور آدھی زمین پر لٹک کر سو بھی گئی-

بڑھیا کی بڑبڑاہٹ میں بھی خراٹوں میں نہ جانے کب بدل گئی-

اصغر نے چھتری کو کھمبے سے لگا کر کھڑا کیا اور کھچ کھچ بجانے والی نیلی واسکٹ

کو اتار کر کرتے سے پسینے کی آبشار پونچھتے ہوئے لان میں قدم رکھا۔ پہلے بڑی احتیاط سے ایک شریر بچے کی طرح روٹھ کر سوئی ہوئی بڑھیا پر نظر ڈالی اور پھر بہو پر آموں اور خربوزوں کی پوٹلی کو زمین پر رکھ کر کچھ سر کھجایا اور جھک کر بہو کی بانہہ بھینچ دی۔

"اوں-----" بہو تیوریاں چڑھا کر اینٹھی اور اس کا ہاتھ جھٹک کر مڑ کر سو گئی۔

اصغر نے پوٹلی اٹھائی۔ جیب میں نئی چوڑیوں کی پڑیا ٹٹولتا ہوا کوٹھڑی میں چلا گیا۔ بہو نے ہوشیار بلی کی طرح سر اچکا کر بڑھیا کو دیکھا اور دوپٹہ اوڑھتی جھپاک سے کوٹھڑی میں۔

لو رک گئی۔ پسینے کے شراٹے چل نکلے مکھیاں آموں کے چھلکوں اور کوڑے سے نیت بھر کے منہ کا مزہ بدلنے بڑھیا کے اوپر رینگنے لگیں دو چار نے باچھوں میں بنی ہوئی پیک کو چکھنا شروع کیا دو چار آنکھوں کے کونے میں تندہی سے گھسنے لگیں......

کوٹھڑی میں سے ایک گڑگڑاتی ہوئی بھاری آواز اور دوسری چیچنا ہٹ اوں----- اوں-----" سنائی دیتی رہی ساتھ ساتھ خربوزوں کے چھلکوں اور آموں کے چچوڑنے کی چپڑ چپڑ آواز سکون کو توڑتی رہی۔

مکھیوں کی یورشوں سے دکھی ہو کر آخر بڑھیا پھڑپھڑا ہی اٹھی یہ مکھی ذات جی کے ساتھ لگی تھی۔ پیدا ہوتے ہی گھٹی کی چپچپاہٹ سونگھ کر جو مکھیاں منہ پر بیٹھنا شروع ہوئیں تو کیا سوتے کیا جاگتے بس آنکھ ناک اور ہونٹوں کی طرح یہ بھی جسم کا ایک عضو بن کر ساتھ ہی رہتی تھیں اور مکھی تو نہ جانے سالہا سال سے اس کی دشمن ہو گئی تھی----- جب لکھنؤ میں تھی جب کاٹا۔ پھر جب اناؤ گئی تو برسات میں پھر کاٹا----- اور سندیلہ میں بھی پیچھا نہ چھوڑا اگر بڑھیا کو معلوم ہوتا کہ اسے اس کے جسم کے کون سے مخصوص حصے سے انس ہے۔ تو وہ ضرور وہ حصہ کاٹ کر مکھیوں کو دے دیتی مگر وہ تو ہر حصے پر ٹہلتی تھی وہ کبھی کبھی غور سے اپنی

خاص کنکھی مکھی کو دیکھتی- وہی پتلے پر ٹیڑھی ٹانگیں اور مٹا سا سر- وہ بڑے تاک کر پنکھے کا جھپاکا مارتی----- مکھی تمن نن کر کے رہ گئی-----

آہ معبود----- اسے کتنا ارمان تھا کہ وہ کبھی تو اس مکھی کو مار سکے لنگڑا ہی کر دے اس کا بازو مروڑ کر مرغی کی طرح مروڑ کر گڈی باندھ کر ڈال دے اور مزے سے پاندان کے ڈھکن پر رکھ کر تڑپتا دیکھے مگر خدا تو شائد اس مکھی سے بھی شیطان کی طرح قول ہارے بیٹھا تھا- کہ بس ستائے جائے- اس کی ایک حقیر بندی کو نہ جانے اس میں کیا مزہ آتا تھا مگر اسے یقین تھا کہ اس دوزخی مکھی کا گریبان----- اس مکھی کی فریاد ضرور قہار و جبار کے حضور میں لے کر جائے گی اور ضرور فرشتے انہیں خون پیپ پلا کر کانٹوں پر سلائیں گے- مگر پھر..... یہ کیا مونڈ کاٹی مکھیاں بھی جنت میں جائیں گی اور ساری جنتی فضا مکدر ہو جائے گی----- بڑھیا نے پنکھے کے تیور بنا کر چھپا چھپ اپنے منہ ہاتھوں اور سوکھے پیروں کو پیٹ ڈالا-

"بہو----- اے بہو----- مر گئی کیا-----" وہ جل کر چلائی-

اور بہو تڑپ کر کوٹھڑی سے نکلی----- دوپٹہ ندارد----- گریبان چاک ہاتھ میں آم کی گٹھلی- جیسے کسی سے کشتی لڑ رہی ہو- پھر فوراً لوٹ گئی اور دوپٹہ کندھوں پر ڈالے آنچل سے ہاتھ پونچھتی نکلی-

"ارے بہو----- میں کہتی ہوں----- ارے بوند حلق میں پانی-----"

اصغر بھی شلوار کے پائینچے جھاڑتا کرتے کی پوٹلی سے گردن رگڑتا آیا-

"لو اماں----- کیا خوشبودار امیاں ہیں-----" اس نے بڑھیا کی گود میں پوٹلی ڈال کر کہا-

اور کھٹولی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا-

بڑھیا آموں اور خربوزوں کو سونگھ سونگھ کر مکھیوں کی ناانصافی کو بھول گئی جو اب آموں کی بونڈیوں کا معائنہ کرنے کے لئے اس کی باچھوں سے اتر آئی تھیں-----

"اے بہو----- چھری-----"

بہو نے گلاس دیتے ہوئے آموں کا رس ہونٹوں پر سے چاٹا- اصغر نے پیر بڑھا کر بہو کی پنڈلی میں بکچا بھر لیا----- پانی چھلکا---- اور بڑھیا غرائی-

"اندھی----- میرے پاؤں پر اوندھائے دیتی ہے-----" اور ایسا کھینچ کر ہاتھ مارا کہ گلاس معہ بھاری پیندے کے بہو کے پیر پر----- بہو نے دانت کچکچا کر اصغر کو گھورا- اور چلدی تنتناتی!

"اماں لو پانی-----" اصغر نے فرمانبردار بیٹے کی طرح پیار سے کہا-

"یہ بہو تو وہ بڑی ہو گئی-"

"تمہیں دیکھو-----" بڑھیا نے شکایت کی-

"نکال دے مار کر حرامزادی کو----- اماں اب دوسری لائیں- یہ تو-----" اصغر نے پیار سے بہو کو دیکھ کر کہا-

"اے زبان سنبھال کمینے-----" بڑھیا نے آم پلپلا کر کے کہا-

"کیوں اماں-----" دیکھو نا کھا کھا کر بھینس ہو رہی ہے-----" اس نے بڑھیا کی آنکھ بچا کر کمر میں چٹکی بھر کے کہا- اور بہو نے چھری مارنے کی دھمکی دیتے ہوئے چھری بڑھیا کے گٹے پر پٹخ دی- جو تلملا گئی-

"دیکھتی ہو اماں----- اب ماروں چڑیل کو-----" اور لپک کر اصغر نے دیا دھموکا بہو کی پیٹھ پر اور فرمانبردار بیٹے کی طرح پھر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا-

"خبردار لو----- اور سنو-----! ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گی اپ کے جو تو نے ہاتھ اٹھایا-" بڑھیا غنیم کی طرفداری کرنے لگی----- "کوئی لائی بھگائی ہے جو تو----- اے میں کہتی ہوں پانی لا دے-----" اس نے پھر اسی دم بہو پر برسنا شروع کیا-

بہو کھمبے سے لگ کر منہ تھوتھا کر بیٹھ گئی- اور گلاس سے زخمی ہوئے انگوٹھے کو دبا دبا کر خون نکالنے لگی- بڑھیا مزے سے گٹھلیاں چھوڑا کی اور پھر شکر کا ڈبہ دیتے وقت کچھ ایسا بڑھیا کے پاؤں رکھا کہ خون سے لتھڑا انگوٹھا بڑھیا نے دیکھ

ہی لیا۔

"اوئی۔۔۔۔۔ یہ خون کیسا۔۔۔۔۔؟ پر بہو روٹھ کر پھر کھمبے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اور خون بہنے دیا۔

"اے میں کہتی ہوں ادھر آ۔۔۔۔۔ دیکھوں تو خون کیسا ہے؟" بڑھیا نے پریشانی چھپا کر کہا۔

بہو ہلی بھی نہیں۔۔۔۔۔

"دیکھو تو کیسا جیتا جیتا خون نکل رہا ہے۔۔۔۔۔ اصغر اٹھ تو ذرا اس کے پیر پر ٹھنڈا پانی ڈال۔۔۔۔۔" سلس بھی گرگٹ ہوتی ہے۔

"میں تو نہیں ڈالتا۔۔۔۔۔" اصغر نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"حرامزادے۔۔۔۔۔" بڑھیا خود گھسٹتی ہوئی اٹھی۔

"چل بیٹی پلنگ پر۔۔۔۔۔ اے میں کہتی ہوں یہ گلاس موا سوا سیر کا ہے اس کمینے سے کتنا کہا ہلکا المونیم کا لادے۔۔۔۔۔ مگر وہ ایک حرام خور ہے لے اٹھ ذرا۔" بہو ٹس سے مس نہ ہوئی بلکہ کہنی آگے کو کر کے جھوٹ موٹ ناک دوپٹے سے پونچھنے لگی۔

"لا پانی ڈال صراحی میں سے۔۔۔۔۔" اور اصغر سینے پر پتھر رکھ کر اٹھا۔

بڑھیا سوکھے سوکھے لرزتے ہاتھوں سے خون دھونے لگی مگر یہ معلوم کر کے کہ بجائے زخم پر پانی ڈالنے کے وہ بہو کے گریبان میں دھار ڈال رہی ہے اور بہو اس تاک میں ہے کہ قریب آتے ہی اصغر کا کان دانتوں سے چبا ڈالے وہ ایک دم بکھر گئی۔

"خاک پڑے تیری صورت پر۔۔۔۔۔" بڑھیا نے اصغر کے ننگے شانے پر سوکھے پنجے سے بدھیاں ڈال کر کہا اور اس نے ایک سسکی لے کر جل کر سارا پانی بہو پر لوٹ دیا اور خود روٹھ کر آم کھانے چلا گیا ماں بیٹے کے لئے ڈھائی گھڑی کی موت آنے کا ارمان کرنے لگی۔

"بدذات۔۔۔۔۔ ٹھہر جا۔۔۔۔۔ آنے دے۔۔۔۔۔ اپنے چچا کو وہ کھال

ادھڑواتی ہوں کہ بس-----" بڑھیا نے میلی دھجی کی پٹی باندھ کر کہا۔

"بے بس----- اب پلنگ پر لیٹ جا-----" بڑھیا نے زخم کو انتہائی خطرناک بنا کر کہا اور پھر بہو کے نہ ہلنے پر خود ہی بولی----- "اے ہاں----- لے اصغر بہو کو کھٹولی پر پہنچا دے-----"

"مجھ سے تو نہیں اٹھتی یہ موٹی بھینس کی بھینس-----" اصغر جلا کر بولا۔

"ارے تیرے تو باپ سے اٹھے گی۔ سنتا ہے کہ اب۔"

اور جب وہ پھر بھی بیٹھا رہا تو بڑھیا خود اٹھانے لگی۔

"اماں----- میں آپ اٹھ جاؤں گی-----" بہو نے بڑھیا کی گدگدیوں سے گھبرا کر کہا۔

"نہیں بیٹی----- میں-----" اور اس نے پھر اصغر کی طرف آنکھیں گھما کر دیکھا گویا کہہ رہی ہے کہ ٹھہر جاؤ میاں دودھ نہ بخشوں اور پر نہ بخشوں۔

اصغر بھنا کر اٹھا۔ اور ایک جھپاکے سے بہو کو اٹھا کر چلا کھٹولی کی طرف بہو نے موقع کی مناسبت سے فوراً فائدہ اٹھا کر اسی جگہ دانت گاڑ دیئے جہاں ابھی ساس کا سوکھا پنجہ پڑا تھا۔

اور اصغر نے کلکچا کر اسے کھٹولی پر پٹخ دیا----- اور اس کے سرخ سرخ ہونٹ چٹکی سے مسل دیئے۔

بہو ناک چھپا چھپا کر فتح مندانہ طریقے پر ہنستی رہی اور اصغر اپنے نیل پڑے ہوئے کندھے کو سہلا سہلا کر غراتا رہا۔

ساس وضو کے آخری مرحلے طے کر رہی تھی اور آسمان کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ بڑبڑا رہی تھی-----!

جانے کیا----- شائد بے حیا بہو کو کوس رہی ہو گی۔

جال

"عطن، صفیہ ---- اے کہاں مر گئیں؟"

"ای، ی، ی۔" عطن کی جی سنائی دی۔

"آئی بی۔" صفیہ چیخی اور دونوں لڑکیاں برآمدے کے انتہائی کونے والے اندھیرے کمرے سے بیلوں کی طرح نکلیں۔ عطن کا کرتہ کیلی میں الجھ کر جھرے بولا اور صفیہ کی جوتی دہلیز میں پھنسی اور وہ گھٹنوں کے بل اگالدان کے پاس گری۔ اگالدان کئی دن کا بھرا بیٹھا تھا۔ پھیل پڑا اور صفیہ کے گھٹنے چھالیہ ملی ہوئی گاڑھی گاڑھی پیک میں لبڑ گئے۔

"مٹو نہ تم! دیکھ کے تھوڑی چلیں ہیں۔ لاڈو کے دیدوں میں پانی اتر آیا ہے..... آج اتوار کے دن بھی مری پڑی ہیں۔"

"یہ دوپٹہ تو دیکھو ---- کیا مجال جو پلو ڈالیں ---- جانو نہنیاں دھری ہیں اب تک ----"

صفیہ فرش پر پیک ٹپکاتی غسل خانہ کی طرف چلی اور عطن نے دوپٹہ دوہرا پلو ڈال کر کندھے ذرا ڈھلکائے اور سینہ اندر کو دھنسا لیا۔

"میں کہتی ہوں قرآن پڑھا؟"

"جی ---" عطن کلبلائی۔

"اے قرآن پڑھا آج صبح؟"

"اوں ---- صفیہ ---- آں ----" عطن انگلیاں مروڑنے لگی۔

"صفیہ کا نہیں میں تو تمہارا پوچھتی ہوں ---- عشاء کی نماز بھی ہضم کر

گئیں کیا کیا ملانی ماں نے جگایا۔ مگر جانو سانپ سونگھ گیا۔"

"انھوں نے تو۔۔۔۔" اور عطن کا جی چاہا چوکی کے نیچے گھس جائے۔ خالہ بی نے اسے سر سے پیر تک گھورا۔۔۔۔ معنی خیز ٹھوکا لگایا۔ کچھ بی کے کان میں گھس پسائیں۔ سرہلائے سروتے گھمائے اور دونوں کسی معقول نتیجہ پر پہنچیں۔

"چلو دور ہو یہاں سے۔" پھر خالہ بی سے "اے ہاں تو مجھے کیا معلوم۔۔۔۔ ذرا ذرا سی بچیاں۔۔۔۔ نگوڑی۔"

عطن کندھے ڈھلائے ترچھے ترچھے پیر مارتی اسباب والے کمرے میں چلی گئی۔ دوپہر کو دونوں گھنٹہ بھر سر جوڑے ادھوری ادھوری باتیں کرتی رہیں پھر پرانے پاجامہ کے دو عجیب و غریب تراش کے شلوکے اسی چوہوں کے بو آتے ہوئے اندھیرے کمرے میں بیٹھ کر تیار کئے۔ جنہیں پھنسا کر ان کی سانسیں گھٹنے لگیں۔ مگر نتیجہ اطمینان بخش رہا۔ جیسے سڑک کوٹنے کا انجن چل گیا۔ ہائے بھیا کے کتنے مزے تھے۔ مزے سے کرتہ اتارے پائنچے چڑھائے گھوما کرتے تھے اور یہاں ان کی پنڈلیوں میں مہین مہین گرمی دانے ہو گئے تھے جو سوئیوں کی طرح چبھا کرتے تھے۔

عطن کا دل چاہتا کاش وہ مرجائے اور یہی بچاری صفیہ کا دل چاہتا۔ دونوں اندھیرے کمرے میں دردناک کہانیاں پڑھتیں۔ دونوں کے دل بھر آتے۔ اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتیں۔

"بجو میرا تو کلیجہ پھٹا جاتا ہے۔"

"سون۔" عطن سبکی لیتی۔ آہ وہ دردناک کہانیوں کی خوش نصیب ہیروئنیں جو مرگئیں۔ کاش وہ دونوں بھی اسی طرح مرسکتیں۔ تب بی اور خالہ اور ملانی چیخیں مار مار کر روتیں۔ "ہائے میں اپنی عطن کا سہرا بھی نہ دیکھنے پائی۔۔۔۔ ہائے میں اپنی صفیہ کو دلہن بھی تو نہ بنا پائی۔۔۔۔" اور دلہن بننے سے پہلے ہی اللہ کی پیاریاں ہو جانے کے خیال ہی سے ان کی آنکھیں امڈ آتیں گلے بھر جاتے۔ محلّہ میں بھوری کی کنواری بیٹی مرگئی تو اس کا جنازہ کیا خوبصورت سجایا گیا تھا۔ سرہانے کے پایوں

سے لمبا سا مہکتا ہوا سہرا باندھا گیا۔ سرخ گوٹے کی اوڑھنی جسے زندگی میں وہ چھونے کو ترستی رہی اس پر ڈالی گئی اور بھوری جو اٹھتے بیٹھتے اسے کوسا کرتی تھی۔ اس پر جان دینے لگی۔ بجائے مرنے جوگنی" "پیاروں پٹی" "کھاٹ کٹی" کے وہ اسے "میری لاڈو" "میری بنو" "میری شہزادی" کہنے لگی تھیں۔ کیا عطن، صفیہ مر جائیں تو بی اسی طرح چنگھاڑیں گی۔ خالہ بھی سر پھوڑیں گی۔ ملانی ماں بال نوچیں گی اور ملانی ماں کے بال نوچنے کے خیال سے ان کی باچھیں کھل جاتیں وہ کیسے کیسے ان کے جھونٹے نوچا کرتی تھیں۔ کتنی خوش ہوتی جب تخیل کی نظروں سے وہ ان سب کو اپنے کفنوں میں لپٹنے کو تیار قبروں میں کودتے، دھمکیاں دیتے محسوس کرتیں۔ پھر خود ان کا دل بھر آتا گلے سوجنے لگتے سینے پھول جاتے اور وہ عجیب و غریب تراش کے شلوکے ان کا دم گھوٹنے لگے۔

اور اتوار دن کو غسل ہوتا جو غسل میت سے کم نہ ہوتا۔ بھریادیہ کھلی کوٹ کر بھگو دی جاتی۔ مرچوں دار السی کی کھلی۔ اسی سے جوئیں مر جاتی ہیں۔ جب مرغیوں کے رجیں پڑ جاتی ہیں تو مٹی کا تیل لگاتے ہیں۔ جس سے ان کی کھال تو ادھڑ جاتی ہے۔ پر جوئیں مر جاتی ہیں۔ یہ کھلی مٹی کے تیل کا کام دیتی تھی۔ جب خوب پھول جاتی تو کھلی کے لوتھڑے ملانی ماں ان کی کھوپڑیوں پر تھوپ کر گھسے مارتیں اور اس غضب کے پہلوانی ہاتھ دکھاتیں کہ غریب عطن، صفیہ کی گردنیں زمین سے لگ لگ جاتیں، کولھے ہوا میں اٹھ جاتے اور پیڑھیاں الٹی ہو جاتیں ----
اور ----

"اے ہے بوا ڈھی پڑتی ہو ---- گردن میں ست نہیں" ---- ملانی ماں غراتیں اور ان کے آنسو کھلی کی جھان میں مل کر ان کی آنکھیں پھوڑنے لگتے، ناک جل اٹھتی، کنپٹیاں پھٹنے لگتیں۔ یہ بال پیدا کرنے میں اور وہ بھی ملانی ماں کی پہلوانی کو دیکھتے ہوئے اللہ میاں نے کیا مصلحت سمجھی۔ گنجوں کو نہ تیل کی فکر نہ کنگھی کا غم نہ روز روز کھلی کے گھسے! ایک دفعہ عطن کو جب موتی جھارا ہوا تھا تو سارے بال اتروا دیئے گئے تھے۔ کس مزے سے ہلکی ہلکی گھوما کرتی تھی مگر ایک اور مصیبت

تھی کہ ٹیکہ جھومر بھی ہاتھ سے جاتا تھا۔ صفیہ اور آپا کیا مزے سے طباق جیسے منہ پر ٹیکے لگا کر گئیں اور وہ سر منڈھے بیٹھی رہی۔

"چار لوٹے دائیں شانے پر اور چار لوٹے بائیں پر ----" ملانی ماں پاک ہونے کے اصول بتاتیں۔ اب اگر جاڑے ہوتے تھے تو کیسے چار لوٹے چار چلو ڈالنا دشوار ہو جاتے اور جو گرمیاں ہوتیں تو مزے سے نل کے نیچے بیٹھ گئیں اور تڑا تڑ پانی پڑ رہا ہے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی سلاخیں جسم کی شکنوں پر پھسل رہی ہیں۔ پانی قل قل کرتا رانوں پر کود تا شانوں پر پھسلتا موری میں جا گرتا ----- جیسے کوئی شراب انڈیل رہا ہو ---- نیند سی آنے لگتی اور ویسے بھی غسل خانہ کی فضا میں سوا رج مل جاتا' آزادی! پر پرزوں سے آزاد ---- مزے نے چوکی پر سے نل کی پنڈی پر وہاں سے میلے کپڑوں کے پاس پھر صابن لینے یا بیسن اتارنے الماری کے بالائی حصہ پر آزادی سے پھدکا کرتیں۔ بے کار بیکار ہی وہ قلانچیں بھرتیں۔ ہوا جسم پر لپٹ جاتی۔ ہاتھ پیر ہلکے ہو جائے صابن ملتیں چکنے چکنے ہاتھ ایسے پھسلتے کیا بتائے جیسے کسی نے ریشمی کپڑوں میں لپیٹ دیا ہو۔ بیسن ملتیں ہلکی ہلکی میٹھی سوزش دردرے دال کے دانے سوندھی خوشبو' جی چاہتا ہولے ہولے انگلیاں پھیرے جائیں۔ جی چاہتا کوئی کانٹوں دار چیز کی رگڑ اس مسلسل گدگدی کو مٹا دے ----"

"اے ابھی تک میت نہا نہیں چکی۔" کی صدا انہیں جگا دیتی اور وہ نل کی دھار کو آخری مرتبہ بازوؤں میں بھینچنے کی کوشش کرتیں اور تھکی ہوئی آنکھوں سے ان عجیب و غریب تراش کے شلوکوں کو دیکھتیں جو سڑک کوٹنے کے انجن کا کام کرتے تھے اور تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے پسینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چراند آنے لگی تھی۔ اتنا سلیقہ کہاں تھا کہ رات کو چپکے سے دھو کر پھیلا دیتیں اور صبح ہی صبح اٹھا لیتیں۔ ایک دن کمبخت بھیا کے ہاتھ پڑ گیا تو نہ جانے کیوں انہوں نے سب کے سامنے جا کر دکھانا شروع کیا۔ کوئی بھی تو نہ پہچانا کہ وہ کس قسم کا ہتھیار ہے۔ آخر میں بھیا نے فیصلہ کیا کہ نو کا جانگیہ ہے جسے وہ گندی دوائیوں کے لئے استعمال کرتا ہے۔

"صاب اگر میرا ہوئے تو بدن میں کیڑے ہی پڑیں---- دین محمد کا ہوئے گا۔"

---- اور دین محمد صاف مکر گیا اور اس کے مالک کو موٹی موٹی گالیوں والی بیماریاں لگانے لگا----

عطن، صفیہ سر جھکائے کلام اللہ کی تلاوت کرتی رہیں۔ کبھی کبھی ان کی آنکھیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں اور لب ہلنے لگتے اور اس کے بعد سے یہ دستور ہو گیا تھا کہ جب وہ بھیانک شلو کے گل جاتے اور پرانے کاغذ کی طرح بکھرنے لگتے اور میل کی پپڑیاں چبھنے لگتیں اور جس مقصد کے لئے وہ بنائے جاتے تھے وہ خبط ہو جاتا تو وہ اس کی گولی بنا کر سنڈاس میں ڈال آتیں اور اوپر سے بھر کر چھا راکھ۔

عطن، صفیہ جڑواں تو نہیں پیدا ہوئی تھیں مگر فضا نے انہیں توام رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دنیا میں وہی ایک دوسرے کی ہمدرد جیون ساتھ اور سہارا تھیں جب عطن کی کمر میں درد ہوتا اور وہ کٹی مرغی کی طرح لوٹتی تو صفیہ گرم پانی کی بوتل لاتی۔ دیر تک ساتھ بیٹھی کمر مسلا کرتی اور جب صفیہ کی پنڈلیاں پھٹتیں تو عطن ہی دوپٹہ کی پٹیاں کس کر تشنج کو روکتی اور زندگی کی سڑک پر ایک دوسرے کا سہارا بنی چلی جاتیں۔

مگر اسکول میں یہ سہارے بٹ جاتے چونکہ الگ الگ کلاس میں تھیں۔ لہٰذا قانون کے مطابق عطن کو مس چرن پر مرنا پڑتا اور صفیہ کو مس حیدر پر۔ مگر پھر بھی صفیہ بھول کر بھی مس چرن کی پھٹارہ سانپ جیسی سیاہ رنگت اور اینٹھی ہوئی ناک پر آوازہ نہ کستی اور نہ ہی کبھی عطن نے ہی کسی کو مس حیدر کے مصنوعی جوڑے اور آنگی ساری کا طعنہ دیا۔ وہ مل جل کر ایک دوسرے کی دوست بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ بھیا کبھی کبھی ان بھگتی ہوئی استانیوں کو دیکھ آتے تو بس اندھیر مچا دیتے۔ ایک دفعہ بڑی مشکل سے انہوں نے بھیا سے کیمرہ لیا اور فلم ڈلوا کر مس چرن اور مس حیدر کی آڑی ترچھی دھندلی تصویریں کھنچوائیں۔ جب بھیا فلم دھلو کر لائے تو

انھوں نے سب کے سامنے ان کی شکلوں کا مذاق اڑایا۔ کہ عطن صفیہ کا پھر سے درد ناک کہانیوں کی ہیروین کی طرح مرجانے کو جی چاہا تاکہ بھیا کو کچھ تو رنج پہنچے۔ وہ سر پھوڑیں اور اطمینان سے ان کی لاشیں مسکراتی رہیں۔

یہی نہیں اور لاکھوں دکھ ان کی جان کو لگے تھے۔ زندگی ایک جال کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ جس کا تانا خالہ بی تھیں اور بانا ملانی ماں۔ قدم قدم پر پھندے ہر سانس پر گانٹھیں۔ ارے اور تو اور یہ انور بھائی، رشید بھائی، قطب بھیا اور نہ جانے کتنے "بھائی" آتے مگر سب کے سب آپاؤں اور باجیوں کو تاکتے آتے!

"عطن ---- بنو ذرا یہ سروری کو تو دے آؤ ---- لپک کے ----"

"صفو بیٹا پھر ہم تمہیں بڑی اچھی چیز لادیں گے ---- ذرا یہ کبرے کو دے آؤ ---- ہاں چھپا کر دینا۔ خالہ بی نہ دیکھیں سمجھیں۔"

"کیا چیز لادیں گے آپ؟" وہ پوچھتیں۔

"اب جو کچھ بھی تم کہو۔ گڑیا، تکیہ کے غلاف کی جالی --- لپک کے جاؤ ---"

اور وہ لپک کر جاتیں۔ آئے دن بنڈل اور لفافے خالہ بی وغیرہ سے چھپا کر دشمن کے خیمے تک لے جاتیں ---- اور ان کا جی جلتا، جان سلگتی ----- جیسے دیکھو گڑیاں دیئے جاتا ہے۔

"نفرت ہے مجھے تو کلموہیوں سے ----- میں تو سب مینو کے دے دوں گی۔"

----- عطن ناک پھڑکاتی جیسے بس انہیں گڑیوں ہی کی تو ضرورت تھی! آخر یہ "بھائی" اپنی بہنوں کو گڑیاں کیوں نہیں دیتے۔ پر وہ تو نام کو تھا۔ گھنٹوں کوٹھوں پر چھپ کر باتیں ہوتی تھیں۔ کاش کوئی ان کا بھی ہوتا۔ کاش زینوں اور گیلریوں میں پریشان کرتا۔ ان کے لئے بھی بنڈل اور لفافے آتے جنہیں لے کر وہ بھی منہ لال شرمائی ہوئی پلنگوں پر اوندھی پڑ جایا کرتیں۔ مگر کہاں ان کی قسمت میں

تو کوئلوں کی دلالی لکھی تھی- ادھر ادھر قاصد بنے پھرنا-

مگر بد حال تو وہ اس دن ہوئیں جس دن انھوں نے امانت میں خیانت کی اور ایک بنڈل کھول ڈالا کچھ دیر تو وہ الٹ پلٹ کر دیکھتی رہیں- خاک سمجھیں ریشم اور نازک نازک فیتوں کا الجھا ہوا جال سا! مہین گلابی جالی دار مغزی باریک ربڑ کی ریشمی ڈوریاں! اوہ! جلدی سے انھوں نے شرما کر پرانے کپڑوں کی الماری میں چھپا دیا اور لپک کر باہر نکل آئیں- دل دھک دھک کرنے لگے سانسیں پھول گئیں اور باہر آکر وہ گیہوں چنوانے لگیں- گویا بڑے ہی کام کی بیٹیاں ہیں-

مگر دلوں میں کھد بد ہنڈیا پکتی رہی- سر جھکائے گیہوں انگلیوں کے سروں سے بکھیرتی رہیں مگر آنکھوں کے سامنے گلابی ریشم کے جال بنتے بکھرتے رہے- وہ معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتیں اور مسکرا پڑتیں- ننھا سا معصوم راز ان کے سینے میں بھٹی کی طرح دہک رہا تھا جس کی سوزش سے چہرے تمتمائے جاتے تھے- گویا وہ جنوں یا پریوں کی دنیا سے کچھ اڑا لائی ہیں اور کسی کو بھی نہیں معلوم کہ ان پرانے گودڑ کے لچھوں میں کیسا لال چھپا ہوا ہے- کھانے کے بعد وہ الماری کے قریب سے گزریں اور ایک دم سے عطن کو بڑی زور سے ہنسی آئی------ اور صفیہ کو بھی اور دونوں بیتاب ہو کر اندھیرے کمرے کی طرف بھاگیں-

"غضب خدا کا کیا ہی ہی لگا رکھی ہے- جوان جہان لڑکیاں پڑی گھوڑیں کی طرح اچھل رہی ہیں-" ملانی ماں بڑبڑائیں کیونکہ بھاگتے میں عطن کا گھٹنا ان کے پلنگ میں نکلے ہوئے زائد پٹی کے سرے سے ٹکرایا- ہنسی کو روکتی کھوں کھوں کرتی وہ ایک دوسرے پر لد گئیں- ٹکرانے سے گدگدی اٹھی اور فرش پر لوٹنے لگیں-

"بجو------ کھوں------ کھوں کھوں----"

"کھی کھی------ کھی------" عطن نے جواب دیا-

اب جہاں وہ بیٹھتیں، بس وہ گلابی جال پھیلنا شروع ہوتا------ فیتوں کے پلندے کے پلندے چاروں طرف بکھر جاتے، باریک ربڑ دار ریشمی ڈوریاں چاروں طرف سے جکڑ لیتیں اور ان کی سانسیں ایسی پھولتیں کہ بوسیدہ گلے ہوئے بھیانک

شلوکے چر چر پھٹنے لگتے۔

اور پھر فرصت کے وقت جب سب سو جاتے تو وہ چپکے سے لوٹ کا مال نکال کر اندھیرے کمرے کی سہاؤنی تاریکی میں دیکھا کرتیں۔ ذرا ایک دوسرے کے سامنے کھل کر دیکھنے سے جھجک آتی تھی۔ لہٰذا ایک دن عظمیٰ نے اکیلے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر صفیہ چیل کی طرح جھپٹ کر پہنچی یہ بے ایمانی تھی۔ سراسر بے ایمانی!

"آپا جی کو دے آئیں----" انہوں نے فیصلہ کیا۔

"اور کیا دے ہی آئیں----- انور بھائی-----" دونوں کے گلے رندھ گئے۔

ایک دوسرے پر اعتبار اٹھنا شروع ہوا۔ وہ ایک دوسرے کو اکیلا چھوڑتے ڈرتیں۔ سانپ کی طرح ایک دوسرے کی حفاظت کرتیں۔ اگر عظمیٰ اٹھ کر کسی طرف جاتی تو صفیہ فوراً جوتا پہننے لگتی۔ وہ محبت وہ لگاؤ ٹوٹ گیا----- عظمیٰ کے درد اٹھتا تو صفیہ منہ موڑے سوتی بنی رہی اور دوپٹے کی پٹیاں نہ باندھیں۔ جب صفیہ کی کمر میں ٹیسیں اٹھتیں تو عظمیٰ نے گرم پانی کی بوتل لا کر نہ دی اور دعائیں مانگتی رہی کہ ایسا درد اٹھے ایسا اٹھے کہ وہ بے ہوش ہو جائے پھر ہوش میں نہ آئے لوگ سر پھوڑتے ہیں کرتے لال گوٹے کی اوڑھنی ڈال کر اسے قبرستان لے جائیں---- اور ادھر وہ الماری کے آخری کونے سے وہ ریشم کے لچھے نکال کر---! مگر کہاں! وہ دن بدن موٹی ہوتی نظر آتیں---- صفیہ کے رخسار کی ہڈیوں پر دو ہلکے سرخ ٹپے پھیلنے لگتے تھے اور عظمیٰ کا جوتا کاٹنے لگا تھا۔ وہ ہیبت زدہ ہو ہو کر ایک دوسرے کی تندرستی سے لرزتیں۔ دونوں یہ ظاہر کرتیں کہ وہ اس گلابی ریشم کے پھندوں سے بالکل آزاد تھیں اور ذرا بھی وہ ان کے گلے میں پھانسی نہیں لگایا کرتے۔

کہتے ہیں خدا جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کبریٰ کا جہیز سل رہا تھا۔

آپا بی کو بلایا خالہ عباسی نے جمپر کترنے کے لئے۔

"کوئی چلتا ہے میرے ساتھ----!" وہ عطن صفیہ کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ان دونوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔

عطن تو اچھی بیٹی بنی بی کے پانچوں میں جھول ڈال رہی تھی۔ قسمت کی ماری صفیہ بیٹی قینچی سے کترنوں کے پھونسڑے اڑا رہی تھی۔

"چل صفیہ کی بچی تو چل----- بیٹھی قینچی کا ناس مار رہی ہے----- جلدی اٹھ۔"

"کہاں؟" صفیہ چونکی۔

"عباسی خالہ کے اور کہاں---- جلدی اٹھ۔"

"آں----- اور بجو-----" بی غرائیں عطن سر جھکائے سیتی رہی ڈر کے مارے ٹانکہ بھی تو نہ توڑا کہ کہیں پکڑی نہ جائے۔ صفیہ نے ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔

عطن کے ہاتھ ہلنے لگے' دل زور زور سے پسلیوں سے ٹکرانے لگا۔

"لے بیٹی ذرا یہ دو ٹانکے بند میں لگا دے----" ملانی ماں نے چھینٹ اور چار خانے کی کترنوں کی مداری کے تھیلہ کی شکل کی چیز دے کر کہا۔

جیسے ریل چھوٹی جا رہی ہے---- دھائیں دھائیں انجن کٹنے لگے۔ اٹھی بڑی بے پروائی سے گویا اسے ذرا بھی تو جلدی نہیں!

"لیجو بیٹی----- یہ بٹن----" تایا ابا بیل گاڑی کے پہیوں کی سی آوازیں اپنی چپلوں میں سے نکالتے ہوئے آن پہنچے۔

"ذرا پان دھو کر پٹاری میں رکھ دینا بیٹی---- ذرا جھنیٹا دے دینا----" آج تو بی کو بھی اسے پیارے پیارے تکلے اتارنے کی سوجھ رہی تھی---- اللہ----- یہ تایا ابا۔ ایسا قولنج کا درد اٹھے کہ قبر ہی میں بند ہو۔

اگر ذرا دیر اور یہ تناؤ رہتا تو عطن کی رگیں پھٹ جاتیں اور اس پر فالج گر جاتا۔ جیسے تیسے کرتی وہ پہنچی۔ پولے پولے ہاتھوں سے جیسے چڑیا کا بچہ اٹھاتے ہیں۔

اس نے وہ جال اور ریشم کا گچھا اٹھایا۔ دبے پیر رکھتی جیسے نئی دلہن پہلی دفعہ حجلہ عروسی کی طرف جا رہی ہو------ کہیں پائل---- چپل نہ چرمرائے! آج اسے معلوم ہوا کہ وہ کس قدر بھدی تھی۔ خاموش چاندنی جیسی دھندلی روشنی میں وہ اندھیرے اسباب کے کمرے میں ہونٹ بھینچے کھڑی رہی..... چٹخنی چڑھانے میں کیا زور سے کھڑکی۔ وہ آواز دبانے کو زور زور سے کھانسنے لگی۔ پھر قدم جماتی وہ بڑھی۔ اور ایک لمحہ میں ریشم اور فیتوں کا مختصر سا جال اس کی انگلیوں میں الجھنے لگا جیسے ٹھنڈے پانی کی دھار کھول دی! جو اس کی رگ رگ پر پھسل کر بہنے لگی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے بھینچا اور پھر چھوڑ دیا۔ سر سے سانپ کی کینچلی کی طرح مچل کر بکھر گیا۔ دوسرے لمحے وہ پر پرزوں سے آزادی ٹھنڈے ٹھنڈے اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کے جال میں جکڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوا وہ اوپر اٹھنے لگی----- اوپر بہت اونچی----- ہلکی پھلکی مہکتی ہوئی تیتری کی طرح-----! سانس زور زور سے چلنے لگا---- آنسوؤں کی چلمن نے گلابی پھولوں کے تختوں کو جھومتے دیکھا...... میٹھے میٹھے تشنج سے انگلیاں اینٹھنے لگیں----- مہین مہین سوئیاں کھٹکنے لگیں!

دھڑ------ ہڑ دھڑ----- پھٹ! دروازے کی ڈھیلی چٹخنی ڈھلک گئی----- اور سامنے آپا بی اور ان کے شانہ پر صفیہ کی شریر آنکھیں چمکیں!

باہیں جھول گئیں......! شانے ڈھلک گئے...... اور سر نیچے جھکتا گیا---- اور اس نے ننوا کے جانگئے کی چراند آتے ہوئے مہیب شلوکے میں آنکھیں چھپالیں!
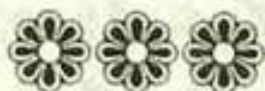
دوزخی

جب تک کالج سر پر سوار رہا، پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی نہ ملی جو ادب کی طرف توجہ جاتی اور کالج سے نکل کر بس دل میں یہی بات بیٹھ گئی کہ ہر وہ چیز جو دو سال پہلے لکھی گئی بوسیدہ، بدمذاق اور جھوٹی ہے۔ نیا ادب صرف آج اور کل میں ملے گا۔ اس نئے ادب نے اس قدر گڑبڑایا کہ نہ جانے کتنی کتابیں صرف نام دیکھ کر ہی واہیات سمجھ کر پھینک دیں اور سب سے زیادہ بیکار کتابیں وہ عظیم بیگ چغتائی کی تھیں "گھر کی مرغی دال برابر" والا مضمون۔ گھر کے ہر کونے میں ان کی کتابیں رلتی پھرتیں مگر سوائے اماں اور دو ایک پرانے فیشن کی بھابیوں کے کسی نے اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔ یہی خیال ہوتا بھلا ان میں ہو گا ہی کیا۔ یہ ادب نہیں پھکڑ مذاق، پرانے عشق کے سٹریل قصے اور جی بہلانے والی باتیں ہوں گی یعنی بے پڑھے رائے قائم، مجھے خود یقین نہیں آیا کہ میں نے عظیم بھائی کی کتابیں کیوں نہ پڑھیں، شاید اس میں تھوڑا سا غرور بھی شامل تھا۔ اور خود ستائی بھی۔ یہ خیال ہوتا تھا یہ پرانے ہیں، ہم نئے۔

ایک دن یونہی لیٹے لیٹے ان کا ایک مضمون "یکہ" نظر آیا۔ میں اور قسیم (چھوٹے بھائی) پڑھنے لگے۔ نہ جانے کس دھن میں تھے کہ ہنسی آنے لگی اور اس قدر آئی کہ پڑھنا دشوار ہو گیا۔ ہم پڑھ ہی رہے تھے کہ عظیم بھائی آ گئے اور اپنی کتاب پڑھتے دیکھ کر کھل گئے۔ مگر ہم جیسے چڑ گئے اور منہ بنانے لگے وہ ایک ہوشیار تھے، بولے "لاؤ میں تمہیں سناؤں" اور یہ کہہ کر دو ایک مضمون جو ہمیں سنائے تو صحیح، معنوں میں ہم زمین پر لوٹنے لگے۔ ساری بناوٹ غائب ہو گئی، ایک تو ان کے مضمون اور پھر ان ہی کی زبانی، یہ معلوم ہوتا تھا ہنسی کی چنگاریاں اڑ رہی ہیں، جب وہ خوب احمق بنا چکے تو بولے۔

"تم لوگ تو کہتے ہو میرے مضمونوں میں کچھ نہیں" انہوں نے چھیڑا۔ ہمارے منہ اتر کر ذرا ذرا سے نکل آئے اور بے طرح چڑ گئے۔ جھنجلا کر الٹی سیدھی باتیں کرنے لگے جی جل گیا اور پھر اس کے بعد اور بھی ان کی کتابوں سے نفرت ہو گئی۔

میں نے ان کے مضامین کی ان کی زندگی میں کبھی تعریف نہ کی حالانکہ وہ میرے مضمون دیکھ کر ایسے خوش ہوتے تھے کہ بیان نہیں۔ اس قدر پیار سے تعریف کرتے تھے مگر یہاں تو ان کی ہر بات سے چڑنے کی عادت تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ میرا مذاق اڑاتے ہیں' اور بخدا جب وہ شخص کسی کا مذاق اڑاتا تھا جو جی چاہتا تھا' بچوں کی طرح زمین پر مل جائیں اور روئیں۔ کس قدر طنز' کیسی کڑوی مسکراہٹ اور کٹتے ہوئے جملے میں تو ہر وقت ڈرتی تھی کہ میرا مذاق اڑایا اور میں نے بدزبانی کی۔

کبھی کہتے تھے کہ "مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں تم مجھ سے اچھا نہ لکھنے لگو" اور میں نے صرف چند مضمون لکھے تھے۔ اس لئے جی چاہتا تھا کہ یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔

ان کے انتقال کے بعد نہ جانے کیوں مرنے والے کی چیزیں پیاری ہو گئیں۔ ان کا ایک ایک لفظ چبھنے لگا اور میں نے عمر میں پہلی دفعہ ان کی کتابیں دل لگا کر پڑھیں' دل لگا کر پڑھنے کی بھی خوب رہی گویا دل لگانے کی بھی" ضرورت تھی' دل خود بخود کھنچنے لگا۔ افوہ! یہ کچھ لکھا ہے' ان رلنے والی کتابوں میں ایک ایک لفظ پر ان کی تصویر آنکھوں میں کھنچ جاتی ہے اور پل بھر میں وہ غم اور دکھ میں ڈوبی ہوئی مسکرانے کی کوشش کرتی ہوئی آنکھیں' وہ اندوہناک سیاہ گھٹاؤں کی طرح مرجھائے ہوئے چہرے پر پڑے ہوئے گھنے بال' وہ پیلی نیلاہٹ لئے ہوئے بلند پیشانی' پژمردہ اودے ہونٹ جن کے اندر قبل از وقت توڑے ہوئے ناہموار دانت اور وہ لاغر سوکھے سوکھے ہاتھ اور عورتوں جیسے نازک دواؤں میں بسی ہوئی لمبی انگلیوں والے ہاتھ اور پھر ان ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ پتلی پتلی کھپچی جیسی ٹانگیں جن کے سرے پر

ورم سے سوجے ہوئے بدوضع پیر جن کے دیکھنے کے ڈر کی وجہ سے ہم لوگ ان کے سرہانے ہی کی طرف جایا کرتے تھے اور سوکھے ہوئے پنجرے جیسے سینے پر دھونکنی کا شبہ ہوتا تھا۔ کلیجے پر ہزاروں کپڑوں بنیانوں کی نہیں اور اس سینے میں ایسا پھڑکتا ہوا چلبلا دل! یا اللہ یہ شخص کیونکر ہنستا تھا۔ معلوم ہوتا تھا' کوئی بھوت ہے یا جن جو ہر خدائی طاقت سے کشتی لڑ رہا ہے۔ نہیں مانتا' مسکرائے جاتا ہے۔ خدائے قہار و جبار بڑھ چڑھ کر کھانسی اور دمے کا عذاب نازل کر رہا ہے اور یہ دل قہقہے نہیں چھوڑتا۔ کون سا دنیا و دین کا دکھ تھا جو قدرت نے بچا رکھا تھا مگر پھر بھی نہ رلا سکا۔ اس دکھ میں جلن' ہنستے نہیں ہنساتے رہنا' کسی انسان کا کام نہیں' ماموں کہتے تھے "زندہ لاش" خدایا اگر لاشیں بھی اس قدر جاندار بے چین اور پھڑکنے والی ہوتی ہیں تو پھر دنیا ایک لاش کیوں نہیں بن جاتی۔

میں ایک بہن حیثیت سے نہیں' ایک عورت بن کر ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی تو دل لرز اٹھتا تھا۔ کس قدر ڈھیٹ تھا ان کا دل۔ اس میں کتنی جان تھی۔ منہ پر گوشت نام کو نہ تھا مگر کچھ دن پہلے چہرے پر ورم آ جانے سے چہرہ خوب صورت ہو گیا تھا' کنپٹیاں بھر گئی تھیں۔ پچکے ہوئے گال دبیز ہو گئے تھے۔ ایک موت کی سی جلا چہرے پر آئی تھی اور رنگت میں کچھ عجیب طلسمی سبزی سی آ گئی تھی جیسے حنوط کی ہوئی ممی! مگر آنکھیں معلوم ہوتا تھا کسی بچے کی شریر آنکھیں جو ذرا سی بات پر ناچ اٹھتی تھیں اور پھر کبھی ان میں نوجوان لڑکوں کی سی شوخی جاگ اٹھتی تھی اور پھر آنکھیں کبھی دورے کی شدت سے گھبرا کر چیخ اٹھتیں۔ ان کی صاف شفاف نیلی سطح گدلی زرد ہو جاتی اور بے کس ہاتھ لرزنے لگتے۔ سینہ پھٹنے پر آ جاتا۔ دورہ ختم ہوا کہ پھر وہی روشنی پھر وہی رقص پھر وہی چمک۔

ابھی چند دن ہوئے میں نے پہلی مرتبہ "خانم" پڑھی۔ ہیرو وہ خود نہیں' ان میں اتنی جان ہی کب تھی مگر ان کا ہیرو ان کے تخیل کا ہیرو ہے' وہ ان کے دبے ہوئے جذبات کا تخیلی مجسمہ ہے جیسے ایک لنگڑا خوابوں میں خود کو ناچتا' کودتا' دوڑتا ہوا دیکھتا ہے' ایسے ہی وہ مرض میں گرفتار نڈھال پڑے اپنے ہمزاد کو شرارتیں کرتا

دیکھتے تھے۔ کاش ایک دفعہ اور صرف ایک دفعہ ان کی خانم اس ہیرو کو دیکھ لیتی۔
شاید اوروں کے لئے خانم کچھ بھی نہیں لیکن سوائے لکھنے والے کے اور باقی کے سارے کیرکٹر درست اور زندہ ہیں۔ بھائی صاحب، بھابی جان، نانی اماں، شیخانی، والد صاحب، بھتیجے، بھنگی، بہشتی۔ یہ سب کے سب ہیں اور رہیں گے۔ یہی ہوتا تھا، بالکل یہی اور اب بھی سب گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کم از کم میرے گھر میں تو تھا اور ایک ایک لفظ گھر کی سچی تصویر ہے۔ جب عظیم بیگ لکھتے تھے تو سارا گھر اور ہم سب ان کے لئے ایکٹنگ کیا کرتے تھے، ہم ہلتے جلتے کھلونے تھے اور وہ ایک نقاش جس نے بالکل اصل کی نقل کر دی۔ جتنی دفعہ خانم کو پڑھتی ہوں وہی معلوم ہوتا ہے، خاندان کا گروپ دیکھتی ہوں۔ وہ بھابی جان اور خانم جھگڑ رہی ہیں، وہ بھائی صاحب شرارتیں ایجاد کر رہے ہیں اور مصنف خود؟ سر جھکائے خاموش تصویر کشی میں مشغول ہے۔
"کھرپا بہادر" جس کا پہلا ٹکڑا "روح لطافت" میں چھپا ہے۔ یہ سب تخیل ہے۔ لاچار و مجبور انسان اپنے ہمزاد سے دنیا جہان کی شرارتیں کروا لیتا ہے۔ خود تو ایک انگلی کا بوجھ نہیں سہار سکتا۔ مگر ہمزاد جی بھر کر مار کھاتا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ مصنف کو ارمان تھا کہ کاش وہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ دوسرے بھائیوں کی طرح ڈیڑھ ڈیڑھ سو جوتے کھا کر کمر جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تندرست لوگ کیا جانیں، ایک بیمار کے دل کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ پر کٹا پرندہ ویسے نہیں تو خوابوں میں تو دنیا بھر کی سیر کر آتا ہے۔ یہی حال ان کا تھا وہ جو کچھ نہ تھے، افسانے میں وہی بن کر دل کی آگ بجھا لیتے تھے، کچھ تو چاہئے نا جینے کے لئے۔
شروع ہی سے روتے دھوتے پیدا ہوئے، روئی کے گالوں پر رکھ کر پالے گئے۔ کمزور دیکھ کر ہر ایک معاف کر دیتا، قوی ہیکل بھائی سر جھکا کر پٹ لیتے۔ کچھ بھی کریں، والد صاحب کمزور جان کر معاف کر دیتے۔ ہر ایک دل جوئی میں لگا رہتا۔ مگر بیمار کو بیمار کہو تو اسے خوشی کب ہو گی۔ ان مہربانیوں سے احساس کمزوری اور بڑھتا، بغاوت اور بڑھتی، غصہ اور بڑھتا۔ مگر بے بس، سب نے ان کے ساتھ

گاندھی جی والی نان وائلنس شروع کر دی تھی۔ وہ چاہتے تھے کوئی انہیں بھی انسان سمجھے۔ انہیں بھی کوئی ڈانٹے انہیں بھی کوئی زندہ لوگوں میں شمار کرے۔ لہذا ایک ترکیب نکالی، وہ یہ کہ فسادی بن گئے جہاں چاہا دو آدمیوں کو لڑا دیا۔ اللہ نے دماغ دیا تھا اور پھر ان کے ساتھ بلا کا تخیل اور تیز زبان، چٹخارے لے کر کچھ ایسی ترکیبیں چلتے کہ جھگڑا ضرور ہوتا۔ بہن بھائی، ماں باپ سب کو نفرت ہو گئی۔ اچھا خاصا گھر میدان جنگ بن گیا اور سب مصیبتوں کے ذمہ دار خود، بس ساری خود پرستی کے جذبات مطمئن ہو گئے اور کمزور، لاچار، ہردم کار کردگی، تھیٹر کا ولن بن گیا اور کیا چاہئے ساری کمزوریاں ہتھیار بن گئیں، زبان بد سے بدتر ہو گئی۔ دنیا میں ہر کوئی نفرت کرنے لگا۔ صورت سے جی متلانے لگا۔ ہنستے بولتے لوگوں کو دم بھر میں دشمن بنا لینا بائیں ہاتھ کا کام ہو گیا۔

لیکن مقصد یہ تو نہ تھا کہ واقعی دنیا چھوڑ دے۔ گھر والوں نے جتنا ان سے کھنچنا شروع کیا، اتنا ہی وہ لپٹے، آخر میں تو خدا معاف کرے ان کی صورت دیکھ کر نفرت آتی تھی۔ وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی، شوہر نہ سمجھتی، بچے باپ نہ سمجھتے۔ بہن نے کہہ دیا "تم میرے بھائی نہیں" اور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے۔ ماں کہتی "سانپ جنا تھا میں نے۔"

مرنے سے پہلے قابل رحم حالت تھی۔ بہن ہو کر نہیں، انسان ہو کر کہتی ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی مر چکیں، آنکھوں میں دم ہے مگر دل دکھانے سے نہیں چوکتے، عذاب دوزخ بن گئے ہیں، ہزاروں کہانیوں اور افسانوں کا ہیرو ایک ولن بن کر مطمئن ہو چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا، اب بھی کوئی اسے پیار کرے، بیوی پوجا کرے، بچے محبت سے دیکھیں، بہنیں واری جائیں اور ماں کلیجے سے لگائے۔

ماں نے تو واقعی کلیجے سے لگا لیا۔ بھولا بھٹکا راستے پر آن لگا۔ آخر کو ماں تھی مگر اوروں کے دل سے نفرت نہ گئی یہاں تک کہ پھیپھڑے ختم ہو گئے، ورم بڑھ گیا، آنکھیں چندھیا گئیں اور اندھوں کی طرح ٹٹولنے پر بھی راستہ نہ ملا۔ ہیرو بن کر بھی ہار ان کی ہی رہی جو چاہا نہ ملا۔ اس کے بدلے نفرت، حقارت، کراہت ملی

'انسان کس قدر پرہوس ہوتا ہے۔ اتنی شہرت اور نام ہونے کے باوجود حقارت کی ٹھوکریں کھا کر جان دی۔ صبح چار بجے آج سے ۴۲ سال پہلے جو ننھا سا بچہ پیدا ہوا تھا وہ زندگی کا کھیل کھیل چکا تھا۔

۲۰ اگست کو صبح چھ بجے شمیم نے آکر کہا "منے بھائی ختم ہو رہے ہیں اٹھو۔"

"وہ کبھی بھی ختم نہ ہوں گے۔۔۔۔ بیکار مجھے جگا رہے ہو" میں نے بگڑ کر صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھر سو جانے کا ارادہ کیا۔

"ارے کم بخت تجھے یاد کر رہے ہیں" شمیم نے کچھ پریشان ہو کر بلایا۔

"ان سے کہہ دو اب حشر کے دن ملیں گے۔ ارے شمیم وہ کبھی نہیں مر سکتے۔" میں نے وثوق سے کہا۔

مگر جب میں نیچے آئی تو ان کی زبان بند ہو چکی تھی۔ کمرا سامان سے خالی کر دیا گیا تھا۔ سارا کوڑا کرکٹ، کتابیں ہٹا دی گئی تھیں، دوا کی بوتلیں لاچاری کی تصویر بنی لڑھک رہی تھیں۔ ننھے بچے پریشان ہو کر دروازے کو تک رہے تھے۔ بھابی انہیں زبردستی چائے پلا رہی تھیں۔ ماں پلنگ کی چادر بدل رہی تھیں۔ سوکھی سوکھی آہیں ان کے کلیجے سے نکل رہی تھیں، آنسو بند تھے۔

"منے بھائی" میں نے ان پر جھک کر کہا ایک لمحہ کو آنکھیں اپنے محور پر رکیں، ہونٹ سکڑے اور پھر وہی نزع کی حالت طاری ہو گئی۔ ہم سب باہر بیٹھ کر چار گھنٹے تک سوکھے بے جان ہاتھوں کی جنگ دیکھتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا، عزرائیل بھی پست ہو رہے ہیں، جنگ تھی کہ ختم ہی نہ ہوتی تھی۔

"ختم ہو گئے منے بھائی" نہ جانے کس نے کہا۔

"وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے مجھے خیال آیا۔

اور آج میں ان کی کتابیں دیکھ کر کہتی ہوں، ناممکن وہ کبھی نہیں مر سکتے۔ ان کی جنگ اب بھی جاری ہے۔ مرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میرے لئے تو وہ مر کر ہی جیسے اور نہ جانے کتنوں کے لئے وہ مرنے کے بعد پیدا ہوں گے۔ اور برابر پیدا

ہوتے رہیں گے، ان کا پیغام دکھ سے لڑو، نفرت سے لڑو اور مر کر بھی لڑتے رہو، یہ پیغام کبھی نہ مر سکے گا۔ ان کی باغیانہ روح کو کوئی نہیں مار سکتا وہ نیک نہیں تھے۔ پارسا نہ ہوتے اگر ان کی صحت اچھی ہوتی۔ وہ جھوٹے تھے، ان کی زندگی جھوٹی تھی، سب سے بڑا جھوٹ تھی، ان کا رونا جھوٹا، ہنسنا جھوٹا۔ لوگ کہتے ہیں، ماں باپ کو دکھ دیا، بیوی کو دکھ دیا، بچوں کو دکھ دیا۔ اور سارے جگ کو دکھ دیا۔ وہ ایک عفریت تھے جو عذاب دنیا بن کر نازل ہوئے تھے اور اب دوزخ کے سوا ان کا کہیں ٹھکانا ہیں۔ اگر دوزخ میں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ہے تو ضرور اس دوزخ میں جانا پڑے گا۔ صرف یہ دیکھنے کہ جس شخص نے دنیا کی دوزخ میں یوں ہنس ہنس کر تیر دکھائے اور تیر اندازوں کو کڑوے تیل میں تلا، وہ دوزخ میں عذاب نازل کرنے والوں کو کیا کچھ نہ چڑا چڑا کر ہنس رہا ہوگا۔ بس وہ تلخ طنز سے بھری ہنسی دیکھنا چاہتی ہوں جسے دیکھ کر دوزخ کا داروغہ بھی جل اٹھتا ہوگا۔

مجھے یقین ہے وہ اب بھی ہنس رہا ہوگا۔ کیڑے اس کو کھا رہے ہوں گے ہڈیاں مٹی میں مل رہی ہوں گی۔ زمانے کے فتوؤں سے اس کی گردن دب رہی ہوگی۔ آروں سے اس کا جسم چیرا جارہا ہوگا۔ مگر وہ ہنس رہا ہوگا۔ آنکھیں شرارت سے ناچ رہی ہوں گی، نیلے مردہ ہونٹ تلخی سے ہل رہے ہوں گے، مگر کوئی اسے رلا نہیں سکتا۔

وہ شخص جس کے پھیپھڑوں میں ناسور، ٹانگیں عرصے سے اکڑی ہوئی، بائیں انجکشنوں سے لدی ہوئی، کولہے میں امرود برابر پھوڑا۔ آخر دم اور چیونٹیاں جسم میں لگنا شروع ہو گئیں۔ کیا ہنس کر کہتا ہے "یہ چیونٹی صاحبہ بھی کس قدر بے صبر ہیں۔ یعنی قبل از وقت ہی اپنا حصہ لینے آپہنچیں---" یہ مرنے سے دو دن پہلے کہا، دل چاہئے، پتھر کا کلیجہ ہو، مرتے وقت جملے کہنے کیلئے۔

ان کا ایک جملہ ہو تو لکھا جائے ایک لفظ ہو تو یاد آئے۔ پوری کی پوری کتابیں ایسے ایسے چٹکلوں سے بھری پڑی ہیں۔ دماغ تھا کہ انجن بنا آگ پانی کے ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ اور زبان تھی کہ قینچی، اس قدر نپے تلے جملے نکالتی تھی کہ جم کر

رہ جاتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کے آگے ان کی گاڑی نہیں چلی۔ دنیا بدل گئی ہے۔ خیالات بدل گئے ہیں۔ ہم نئے لوگ بدزبان ہیں اور منہ پھٹ' ہم دل دکھتا ہے تو رو دیتے ہیں۔ سرمایہ داری' سوشلزم اور بیکاری نے ہم لوگوں کو جھلسا دیا ہے۔ ہم جو کچھ لکھتے ہیں۔ دانت پیس پیس کر لکھتے ہیں' اپنے پوشیدہ دکھوں' کچلے ہوئے جذبات کو زہر بنا کر اگلتے ہیں۔ وہ بھی کبھی تھے۔ نادار بیمار اور مفلس تھے۔ سرمایہ داری سے عاجز۔ مگر پھر بھی اتنی ہمت تھی کہ زندگی کا منہ چڑا دیتے تھے۔ دکھ میں ٹھٹھا لگا لیتے تھے۔ وہ افسانوں ہی میں نہیں ہنستے تھے' زندگی کے ہر معاملے میں ہنس ہنس کر دکھ کو نیچا کر دیتے تھے۔

باتوں کے اس قدر شوقین کہ دنیا کا کوئی انسان ہو۔ اس سے دوستی "کھرپا بہادر" میں جو شاہ لنکران کے حالات ہیں وہ ایک میراثن سے معلوم ہوئے۔ اس سے ایسی دوستی تھی کہ بس بیٹھے ہیں اور گھنٹوں بکواس ہو رہی ہے۔ لوگ متحیر ہیں کریا اللہ! یہ بڑھیا میراثن سے کیا باتیں ہو رہی ہیں مگر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اسی میراثن نے بتایا ہے۔

اور تو اور بھنگن' بہشتن' راہ چلتوں کو روک کر باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ دن اسپتال میں رہے' وہاں رات کو جب خاموشی ہو جاتی' آپ چپکے سے سارے مریضوں کو سمیٹ کر گپیں اڑایا کرتے۔ ہزاروں قصے سنتے اور سناتے وہی قصے سوانہ کی روحیں' مہارانی کا خواب' چمکی اور بڑبڑے بن گئے۔ وہ ہر چیز زندگی سے لیتے تھے۔ اور زندگی میں کتنے جھوٹ ہیں' یہی بات ہے کہ ان کہانیوں میں بہت باتیں بعید از قیاس معلوم ہوتی ہیں چونکہ ان کا شاعرانہ تخیل ہر بات پر یقین کرتا ہے۔

ان کی ناولیں بعض جگہ واہیات ہیں' فضول سی۔ خصوصاً" کو لتار تو بالکل ہی ردی ہے مگر اس میں بھی حقیقت کو اصلی صورت میں گڑبڑ کر کے لکھ دیا ہے "شریر بیوی" تو بالکل فضول ہے مگر اپنے زمانے میں بڑی چلتی چیز تھی۔

"چمکی" ایک دہکتا ہوا شعلہ ہے، یقین نہیں آتا کہ اس قدر سوکھا مارا انسان جس نے اپنی بیوی کے علاوہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ تخیل میں کس قدر عیاش بن جاتا ہے۔ افوہ "چمکی" کی خاموش نگاہوں کے پیغام، وہ ہیرو کا اس کی حرکتوں سے مسحور ہوجانا۔ اور پھر خود مصنف کی زندگی۔۔۔۔ کس قدر مکمل جھوٹ۔ یہ عظیم بھائی نہیں، ان کا ہمزاد ہوتا تھا جو ان کے جسم سے دور ہو کر حسن و عشق کی عیاشیاں کراتا ہے۔

عظیم بھائی کی مقبولیت یوں بھی موجودہ ادب میں یعنی بالکل نئے ادب میں نہ تھی کہ وہ کھلی باتیں نہیں لکھتے تھے۔ وہ عورت کا حسن دیکھتے تھے مگر اس کا جسم بہت کم دیکھتے تھے۔ جسم کی بناوٹ کی داستانیں پرانی مثنویوں گل بکاؤلی، زہر عشق وغیرہ میں بہت نمایاں تھیں اور پھر انہیں پرانی کہہ دیا گیا تھا لیکن اب یہ فیشن نکلا ہے کہ وہ پرانا سینے کا اتار چڑھاؤ۔ پنڈلیوں کی گاؤدمی، رانوں کا گداز نیا ادب بن گیا ہے۔ وہ اسے عریانی سمجھتے تھے اور عریانی سے ڈرتے تھے۔ گو جذبات کی عریانی ان کے یہاں عام ہے اور بہت غلیظ باتیں بھی لکھنے میں نہیں جھجکتے تھے۔ وہ عورت کے جذبات کو تو عریاں دیکھتے تھے مگر خود اسے کپڑے پہنے دیکھتے تھے وہ زیادہ بے تکلفی سے مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور بہت بچہ سمجھتے تھے۔ کبھی کسی جنسی مسئلہ پر تو وہ کسی سے بحث کرتے ہی نہ تھے ایک دوست سے صرف اتنا کہا کہ نئے ادیب بڑے جوشیلے ہیں لیکن بھوکے ہیں اور اوپر سے ان پر جنسی اثر بہت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں "اماں کھانا" معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ ہندوستانی ادب میں ہر زمانہ میں جنس بہت نمایاں رہتی ہیں۔ یہاں کے لوگ جنس سے بہت متاثر ہیں۔ ہماری شاعری، مصوری اور قدیم پرستش سے بھی جنسی بھوک کا پتہ چلتا ہے۔ اگر ذرا دیر عشق و محبت کو بھول جاتیں تو مقبول عام نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت جلد ادب میں ان کا رنگ غائب ہو کر وہی "الف لیلہ" کا رنگ غالب آگیا۔

انہیں حجاب امتیاز علی سے خاص لگاؤ تھا (میں محترمہ سے معافی مانگ کر کہوں گی کہ مرنے والے کا راز ہے) کہا کرتے تھے "یہ عورت بہت پیار سے جھوٹ بولتی

ہے۔"

انہیں شکایت تھی کہ میں بہت ہی الٹے سیدھے جھوٹ بولتی ہوں۔ میرے جھوٹ بھوکے کی پکار ہیں اور ان کے جھوٹ بھوکے کی مسکراہٹیں۔ اللہ جانے ان کا کیا مطلب ہوتا تھا۔

ہم ان کے افسانوں کو عموماً" جھوٹ کہا کرتے تھے' جہاں انہوں نے کوئی بات شروع کی اور والد صاحب مرحوم ہنسے پھر "قصر صحرا" کہنے لگے۔ وہ ان گپوں کو قصر صحرا کہتے تھے۔

عظیم بھائی کہتے "سرکار! دنیا میں جھوٹ کے بغیر کوئی رنگینی نہیں۔ بات کو دلچسپ بنانا چاہو تو جھوٹ اس میں ملا دو۔"

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "جنت اور دوزخ کا بیان بھی تو قصر صحرا ہے۔" اس پر ماموں کہتے "ارے اس زندہ لاش کو منع کرو کہ یہ کفر ہے" اس پر وہ ماموں کے توہم پرست سسرال والوں کا تمسخر اڑاتے تھے۔

انہیں پیری مریدی ڈھونگ معلوم ہوتا تھا لیکن کہتے تھے "دنیا کا ہر ڈھونگ ایک مزیدار جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی مزیدار ہے۔

کہتے تھے "میری صحت اجازت دیتی تو میں اپنے باپ کی قبر پجوا دیتا۔ بس دو سال قوالی کرا دیتا اور چادر چڑھاتا' مزے سے آمدنی ہوتی۔"

انہیں ناچ گانے سے بڑا شوق تھا مگر کس ناچ سے؟ یہ جو فقیر بچے آتے ہیں ان کو عموماً" پیسے دے کر ڈھول پر ناچتے ہوئے اس شوق سے دیکھا کرتے کہ ان کا انہماک دیکھ کر رشک آتا تھا۔ نہ جانے انہیں اس ننگے بھوکے ناچ میں کیا کچھ نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں کبھی نماز پڑھتے نہ دیکھا۔ قرآن شریف لیٹ کر پڑھتے تھے اور بے ادبی سے اس کے ساتھ ساتھ سو جاتے تھے' لوگوں نے ملامت کی اس پر کاغذ چڑھا کر کہہ دیا کرتے تھے' کچھ نہیں' قانونی کتاب ہے جھوٹ تو خوب نبھاتے تھے۔

حدیث بہت پڑھتے تھے اور لوگوں سے بحث کرنے کے لئے عجیب عجیب

حدیثیں ڈھونڈ کر حفظ کر لیتے تھے اور سنا کر لڑا کرتے تھے۔ ان کی حدیثوں سے لوگ بڑے عاجز تھے۔ قرآن کی آیات بھی یاد تھیں اور بے تکان حوالہ دیتے تھے۔ شک کرو تو سرہانے سے قرآن نکال کر دکھا دیتے تھے۔

سیاست سے کم دلچسپی تھی کہتے تھے "بابا ہم لیڈر بن نہیں سکتے تو پھر کیا کہیں' لوگ کہیں گے تم ہی کچھ کر کے دکھاؤ اور یہاں کمبخت کھانسی اور دمہ نہیں چھوڑتا۔" بہت سال ہوئے کچھ مضامین "ریاست" میں سیاسیات اور اکنامکس پر لکھے تھے' وہ نہ جانے کیا ہوئے۔ مذہب کا جنون سا تھا مگر آخر میں آخر بحث کم کر دی تھی اور کہتے تھے۔

"بھئی تم لوگ تو ہٹے کٹے اور میں مرنے والا ہوں اور جو کہیں دوزخ جنت سب نکل آئیں تو کیا میں کروں گا۔ لہٰذا چپ ہی رہو۔"

پردہ کے خلاف تو ابتدا سے تھے مگر آخر میں کہتے تھے "یہ پرانی بات ہو گئی' اب پردہ روکے سے نہیں رک سکتا۔ اس معاملے میں ہم کر چکے جو کرنا تھا اب تو نئی پریشانیاں ہیں۔"

لوگ کہتے تھے "دوزخ میں جاؤ گے" تو فرماتے "یہاں کونسی اللہ میاں نے جنت دے دی جو وہاں دوزخ کی دھمکیاں ہیں۔ کچھ پروا نہیں' ہم تو عادی ہیں۔ اللہ میاں اگر ہمیں دوزخ میں جلائیں گے تو ان کی لکڑی اور کوئلہ بے کار جائے گا کیوں کہ ہم تو ہر عذاب کے عادی ہیں۔"

کبھی کہتے "اگر دوزخ میں رہے تو ہمارے جراثیم مر جائیں گے۔ جنت میں تو ہم سارے مولویوں کو دق میں لپیٹ لیں گے"۔

یہی وجہ ہے کہ سب انہیں باغی اور دوزخی کہتے ہیں وہ کہیں پر بھی جائیں میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں کیا وہاں بھی ان کی وہی قینچی جیسی زبان چل رہی ہے؟ کیا وہاں وہ حوروں سے عشق لڑا رہے ہیں یا دوزخ کے فرشتوں کو پٹا کر مسکرا رہے ہیں' مولویوں سے الجھ رہے ہیں یا دوزخ کے بھڑکتے شعلوں میں ان کی کھانسی گونج رہی ہے۔ پھیپھڑے پھول رہے ہیں اور فرشتے ان کے انجکشن گھونپ رہے ہیں۔

فرق ہی کیا ہے' ایک دوزخ سے دوسری دوزخ میں---- دوزخی کا کیا ٹھکانا۔
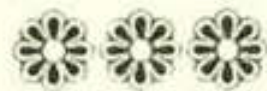
غبار کارواں

میں زار و قطار رو رہی تھی۔

کوئی کسی کو بڑی بے دردی سے مار رہا تھا۔ مارنے والا بہت دیو زاد تھا اور پٹنے والا منحنی سا کالا کلوٹا بچہ تھا۔ کون مار رہا تھا کسے، اور کیوں مار رہا تھا' یہ قطعی یاد نہیں' کیوں کہ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مگر موٹا بنیت جب پٹنے والے کی ہڈیوں پر بجتا تھا تو بڑی خوفناک چٹاخے دار آواز نکلتی تھی۔ جو اب تک میرے کان میں محفوظ ہے اور اکثر سنائی دیتی ہے۔

شاید جب ہی سے مجھے معلوم ہوگیا کہ بڑا چھوٹے کو مارتا ہے اور طاقتور کمزور کو مارتا ہے طاقتور ایک قد آدم ستون کی طرح میرے لاشعور میں کھڑا ہوگیا۔ جس کے پیروں تلے کمزور کوڑے کی طرح پھیلا ہوا تھا تب میرا سر طاقتور کے حضور میں جھک گیا اور کمزور سے گھن آنے لگی۔

پھر بھی دل میں ایک چور تھا جو خود مجھ سے چھپ کر بیٹھ گیا جب کبھی میں کسی عالی شان محل کو دیکھتی جس پر کائی جم جاتی اور گھاس بے رحمی سے چھا جاتی تو دل میں دبکا چور چپکے چپکے مسکرا اٹھتا اور گھاس پھوس کی بے بساط طاقت کا رعب میرے دل میں بیٹھ جاتا۔

ہم اتنے سارے بچے تھے ہماری اماں کو ہماری صورت سے قے آتی تھی ایک کے بعد ایک ہم ان کی کوکھ کو روندتے کچلتے چلے آئے تھے۔ الٹیاں اور درد

ـــ ـــ کر وہ ہمیں ایک سزا سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں کم عمری ہی میں پھیل کر چبوترہ ہوگئی تھیں۔ پینتیس برس کی عمر میں وہ نانی بھی بن گئیں اور سزا در سزا جھیلنے لگیں۔ ہم بچے نوکروں کے رحم و کرم پر پلتے تھے اور ان سے بے طرح مانوس تھے۔

نوکروں کے دو رخ ہوتے ہیں ایک آقا کے سامنے دوسرے آقا کے پیچھے سامنے وہ ہاتھ پیر چومتے ہیں پیٹھ پیچھے گالیاں دے کر دل کی بھڑاس نکالتے ہیں گھریلو نوکر سے زیادہ کوئی بد قسمت اور مجبور طبقہ نہیں خاص طور پر ہندوستان میں جہاں بے کاری اور غربت نے ایک کثیر تعداد کو ایک محدود طبقے کا محکوم اور غلام بنا رکھا ہے ہمارے ہاں چند ایسے نوکر تھے جو پشت ہا پشت سے ہمارے ہی خاندان کی خدمت کرتے آئے تھے جسم کے ساتھ ان کا ذہن بھی غلام بن چکا تھا یہ نوکر نہایت نکمے، غبی اور مکار تھے تنگ آکر نکال دیئے جاتے تو ادھر ادھر دھکے کھا کر پھر کھونٹے پر لوٹ آتے۔ بالکل پالتو کتوں کی طرح سے اب تو ملک ترقی کر گیا ہے اور کچھ بے کاری کم ہوگئی ہے۔ اس لئے اب ایسے غلامانہ ذہنیت کے نوکر نہیں ملتے اپنے بچپن میں میں نے نوکروں کی ایسی درگت دیکھ کر مجھے آقا اور نوکر کے نظام سے ہی نفرت ہوگئی۔ میری بہت سی کہانیوں میں نوکروں کے کردار نظر آتے ہیں کمزور و لاچار نوکر، جھوٹے، مکار اور چالباز نوکر، میری کہانیاں نوکروں سے بھری پڑی ہیں۔ میری محدود دنیا میں طبقاتی تفریق نوکر اور آقا کے رشتہ میں نظر آئی اس نے مجھے متاثر کیا جب باقی کی وسیع دنیا سے واسطہ پڑا تو پتہ چلا اونچ نیچ، ذات پات، صرف ڈھونگ ہے اصل چیز امیری اور غریبی ہے ایک رویہ ہے، امیر خواہ کتنا بھی اللہ والا ہو اور قوم پرست ہو، غریب کے ساتھ نوکر جیسا سلوک کرتا ہے۔ لاڈ پیار کی کسے فرصت تھی نوکروں سے سیکھی ہوئی ہشیاری ہی کارآمد ثابت ہوئی۔ جب کسی چیز کی ضرورت محسوس کی ادھر ادھر ہاتھ مار کر حاصل کی۔

رونے اور گلا پھاڑ کر چلانے میں ہم سب بہن بھائیوں کو خاصی مہارت حاصل تھی ہماری اماں بوکھلا کر ہمارا کہنا ماننے پر مجبور ہو جاتیں ہمیں اپنی اس طاقت

کا شدت سے احساس تھا۔ بچے رو پیٹ کر ہی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتے ہیں۔
ایک دن ایک مجلس میں پہلی بار مرثیوں اور نوحوں کا مطلب سمجھ میں آیا اور جب علی اصغر کے حلق میں تیر پیوست ہونے کا ذکر آیا تو خوف سے میری گھگی بندھ گئی میں نے بری طرح دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کیا۔تمام کرنے والی بیویاں ایک دم چپ ہو گئیں اور بڑی حیرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ سمجھیں شاید تبرک کے انتظار کی زحمتیں ناقابل برداشت ہو گئی ہیں یا کہیں چوٹ چپٹ آگئی یا کسی کیڑے مکوڑے نے ڈس لیا۔
کیوں مارا؟ حلق میں تیر کیوں مارا؟ میں نے حسب عادت مچل مچل کر پوچھا۔ کسی نے میرے سوال کا جواب نہ دیا مجھے پاگل اور ضدی سمجھ کر مجلس سے بھگا دیا گیا گھر واپس آکر فوراً۔ بھائیوں نے میری شکایت کی کہ میں نے مجلس میں فیل مچائے' بدتمیزی کی اور سب کو شرمندہ کروایا۔ سخت ذلت سے نکالی گئی۔
"تیر کیوں مارا؟ ہاتھ میں مار دیا ہوتا بچارے کے حلق میں کیوں مارا؟" میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ اچھا بس بک بک بند کرو اور سو جاؤ" ڈانٹ پڑی۔
مگر میرے حصے کی نیند کہاں! جیسے ہی آنکھ بند کرتی سامنے بچے کے منہ میں چبھا ہوا تیر نظر آتا میں پھر چیخیں مارنے لگی۔
اے غارت ہو بد نصیب' سو جا چڑیل نہیں تو گلا گھونٹ دوں گی۔" باری باری سب بزرگوں نے مجھے قتل کر کے مجھ سے نجات پانے کی دھمکیاں دیں مگر میری سسکیاں نہ رکیں تب ڈر کے مارے میں شیخانی بوا کے پاس گھس گئی کیونکہ اکیلے پلنگ پر مجھے ڈر لگ رہا تھا۔
کیوں مارا تیر میں نے شیخانی بوا کی بغل میں سسک کر پوچھا۔
مگر بھیدی حرامی رہے۔" انہوں نے سمجھایا۔
تو اس کے پاس بچے کو کیوں لے گئے؟"
"بچہ پیاسا رہے۔"
"تو اسے دودھ دیا ہوتا؟"

"دودھ ماں کا کھسک ہوئی گوارا ہے۔"

"تو پانی کہاں رہے؟ نہر پہ تو اوکی پھوج کا پہرہ رہے۔"

"کیوں؟"

"اب امی ہم کا جانیں۔ رہے کچھ گڑبڑ۔"

"پھر؟"

"بچہ کا پانی پیائے کھاطر نہر پہ لئے کے گئے۔ توں مار دہس تیر۔"

"حلق میں؟"

"ہاں۔"

اور میرے حلق میں بڑے بڑے کانٹوں دار گولے پھنسنے لگے۔

"تیر کی بچی نہ سوتی ہے نہ سونے دیتی ہے۔" میری اماں نے ایسے کس کس کے تھپڑ اور گھونسے لگائے کہ سچ مچ میری کربلا کردی۔

برسوں گھر میں میرا اس واقعہ پر مذاق اڑتا رہا۔ جب کوئی مہمان آتا تو بھائی مجھے ذلیل کرنے کے لئے کہتے۔

"یہ مجلس میں بھوں بھوں روئی بھی تھی۔ نکالی گئی۔ پھر اماں نے اس کی خوب ٹھکائی کی۔ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ یہ میری زندگی کا پہلا اہم المیہ تھا اور برسوں اثر رہا مجلسوں میں جاتے میرا دم نکلتا تھا پھر حلق میں تیر مارنے کا ذکر ہوگا اور کانٹوں دار گولے میرے گلے میں اٹکیں گے مجلس کا تقدس بھنگ ہوگا۔

ابھی چند سال ہوئے ہٹلر کے کارناموں کے بارے میں ایک فلم دیکھی لاکھوں گلی سڑی لاشوں کو دیکھ کر میرے ضمیر میں علی اصغر کے حلق میں اٹکا ہوا تیر کھٹکنے لگا۔ ویت نام میں بارہ سال سے خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے۔ سب کہاں ہیں۔ کوئی روکتا کیوں نہیں، انسانیت کب تک یونہی بے بس تماشہ دیکھتی رہے گی۔ انسان نے انسان کا بظاہر گوشت کھانا بند کردیا ہے لیکن اس کی مومیائی بنا کر اب بھی ہضم کر رہا ہے۔ مجھے ایسی دنیا سے پیار نہیں۔ اس کے اصولوں سے گھن آتی ہے۔

ایک اور واقعہ میرے بچپن کا ہے جس نے مجھے بہت متاثر کیا- والد کافی روشن خیال تھے- بہت سے ہندو خاندانوں سے میل جول تھا- یعنی ایک خاص طبقے کے ہندو مسلمان نہایت سلیقے سے گلے مل رہے تھے- ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے- ہم کافی چھوٹے تھے جب ہی احساس ہونے لگا تھا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھتے- ہم کافی چھوٹے تھے جب ہی احساس ہونے لگا تھا کہ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف ضرور ہیں- زبانی بھائی چارے کے پرچار کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی احتیاط کا احساس ہوتا تھا- اگر کوئی ہندو آئے تو گوشت ووشت کا نام نہ لیا جائے- ساتھ بیٹھ کر ایک میز پر کھاتے وقت بھی خیال رکھا جائے کہ ان کی کوئی چیز نہ چھو جائے- سارا کھانا دوسرے نوکر لگائیں- ان کا کھانا پڑوس کا مہاراج لگائے برتن بھی وہیں سے منگا دیئے جائیں- عجب گھن سی طاری ہو جاتی تھی- بے حد اونچی روشن خیالی کی باتیں ہو رہی ہیں- ایک دوسرے کی محبت اور جانثاری کے قصے دہرائے جا رہے ہیں انگریزوں کو مجرم ٹھہرایا جارہا ہے- ساتھ ساتھ سب بزرگ لرز رہے ہیں کہ کہیں بچے کہ چھٹے بیل ہیں- کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ دھرم بھرشٹ ہو جائیں-

"کیا ہندو آرہے ہیں-؟" پابندیاں لگتے دیکھ کر ہم لوگ بور ہو کر پوچھتے-
خبردار چاچا جی اور چاچی جی آرہے ہیں- بدتمیزی کی تو کھال کھینچ کر بھوسہ بھر دیا جائے گا-"

اور ہم فوراً سمجھ جاتے کہ چاچا جان اور چچی جان نہیں آرہے ہیں- جب وہ آتے ہیں تو سیخ کباب اور مرغ مسلم پکتا ہے- لوکی کا رائتہ اور دہی بڑے نہیں بنتے- یہ پکنے اور بننے کا فرق بھی بڑا دلچسپ ہے-

ہمارے پڑوس میں ایک لالہ جی رہتے ہیں- ان کی بیٹی سے میری دانت کاٹی روٹی تھی- ایک عمر تک بچوّں پر چھوت کی پابندی لازمی نہیں سمجھی جاتی- سوشی ہمارے ہاں کھانا بھی کھالیتی تھی، دال موٹ، بسکٹ میں اتنی چھوت نہیں ہوتی لیکن چونکہ ہمیں معلوم تھا کہ سوشی گوشت نہیں کھاتی- اس لئے اسے دھوکے سے کسی

طرح گوشت کھلا کے بڑا اطمینان ہوتا تھا۔ حالاں کہ اسے پتہ نہیں چلتا تھا مگر ہمارا نہ جانے کونسا جذبہ تسلی پا جاتا تھا۔ ویسے دن بھر ایک دوسرے کے گھر میں گھسے رہتے تھے۔ مگر بقر عید کے دن سوشی تالے میں بند کر دی جاتی تھی۔ بکرے احاطے کے پیچھے ٹٹی کھڑی کر کے کاٹے جاتے۔ کئی دن تک گوشت بٹتا رہتا۔ ان دنوں ہمارے گھر سے لالہ جی سے ناتا ٹوٹ جاتا۔ ان کے ہاں بھی جب کوئی تہوار ہوتا تو ہم پر پہرہ بٹھا دیا جاتا۔

"لالہ جی کے ہاں بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جارہا تھا۔ جنم اشٹمی تھی۔ ایک طرف کڑاہ چڑھ رہے تھے اور دھڑا دھڑ پکوان تلے جارہے تھے۔ باہر فقیروں کی طرح کھڑے حسرت سے تک رہے تھے۔ مٹھائیوں کی ہوش ربا خوشبو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ سوشی ایسے موقعوں پر بڑی مذہبی بن جایا کرتی تھی۔ ویسے تو ہم دونوں بارہا ایک ہی امرود باری باری دانت سے کاٹ کر کھا چکے تھے مگر سب سے چھپ کر۔

"بھاگو یہاں سے۔" آتے جاتے لوگ ہمیں دھتکار جاتے۔ ہم پھر کھسک آتے۔ پھولے پیٹ کی پوریاں تلتے دیکھنے کا کس بچہ کو شوق نہیں ہوتا۔

اندر کیا ہے؟ میں نے سوشی سے پوچھا۔ سامنے کا کمرہ پھول پتوں سے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اندر سے گھنٹیاں بجنے کی آواز آرہی تھی۔ جی میں کھد بد ہورہی تھی۔ ہائے اللہ اندر کون ہے۔

"وہاں بھگوان براجے ہیں۔" سوشی نے غرور سے گردن اکڑائی۔

"بھگوان۔" مجھے بے انتہا احساس کمتری ستانے لگا۔ ان کے بھگوان کیا مزے سے آتے جاتے ہیں۔ ایک ہمارے اللہ میاں ہیں نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں۔ نہ جانے کون سی رگ پھڑکی کہ فقیروں کی صف سے کھسک کے میں برآمدے میں پہنچ گئی۔ گھر کے کسی فرد کی نظر نہ پڑی۔ میرے منہ پر میرا مذہب تو لکھا نہیں تھا۔ ادھر سے ایک دیوی جی آرتی کی تھالی لئے سب کے ماتھے پر چندن چاول چپکاتی آئیں۔ میرے ماتھے پر بھی لگاتی گزر گئیں۔ میں نے فوراً ہتھیلی سے ٹیکہ چھٹانا

چاہا۔ پھر میری بدذاتی آڑے آگئی۔ سنتے تھے جہاں ٹیکہ لگے اتنا گوشت جہنم میں جاتا ہے۔ خیر میرے پاس گوشت کی فراوانی تھی اتنا سا گوشت چلا گیا جہنم میں تو کون سا ٹوٹا آجائے گا۔ نوکروں کی صحبت میں بڑی ہوشیاریاں آجاتی ہیں۔ ماتھے پر سرٹیفکیٹ لئے میں مزے سے اس کمرے میں گھس گئی جہاں بھگوان براج رہے تھے۔

بچپن کی آنکھیں کیسے سہانے خوابوں کا جال بن لیتی ہیں۔ گھی اور لوبان کی خوشبو سے کمرہ مہک رہا تھا۔ بیچ کمرے میں ایک چاندی کا پلنا لٹک رہا تھا۔ ریشم اور گوٹے کے تکیوں اور گدوں پر ایک روپہلی بچہ لیٹا جھول رہا تھا۔ کیا نفیس اور باریک کام تھا۔ بال بال کیا خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ گلے میں مالا۔ سر پر مور پنکھی کا مکٹ۔

اور صورت اس غضب کی بھولی۔ آنکھیں جیسے لہکتے ہوئے دیئے۔ میرے ننھے سے دل میں ماما کی ہوک اٹھی۔ بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ہمک کر ہاتھ پھیلا دیئے۔ ضد کر رہا ہے مجھے گودی میں لے لو۔ ہولے سے میں نے بچے کا نرم گرم گال چھوا۔ میرا رواں رواں مسکرا دیا۔ میں نے بے اختیار اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

ایک دم جیسے طوفان پھٹ پڑا اور بچہ چیخ مار کر میری گود سے اچھل کر گر پڑا۔ سوشی کی نانی ماں کا منہ پھٹا ہوا تھا۔ ہذیانی کیفیت طارق تھی جیسے میں نے روپہلی بچے کو چوم کر اس کے حلق میں تیر پیوست کر دیا ہو۔

چاچی جی نے جھپٹ کر میرا ہاتھ پکڑا بھگاتی ہوئی لائیں اور دروازے سے باہر مجھے مری ہوئی چھپکلی کی طرح پھینک دیا۔ فوراً. میرے گھر شکایت پہنچی کہ میں چاندی کے بھگوان کی مورتی چرا رہی تھی۔ اماں نے سر پیٹ لیا اور پھر مجھے بھی پیٹا۔ وہ تو کہو اپنے لالہ جی سے ایسے بھائی چارے والے مراسم تھے اس سے بھی معمولی حادثوں پر آج کل آئے دن خون خرابے ہوتے رہتے ہیں۔ مجھے سمجھایا گیا کہ بت پرستی گناہ ہے۔ محمود غزنوی بت شکن تھا۔ میری خاک سمجھ میں نہ آیا۔ میرے دل میں اس وقت پرستش کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ میں پوجا نہیں کر رہی تھی۔

ایک بچے کو پیار کر رہی تھی۔

اسی سلسلہ میں لوگوں کو میری عاقبت سنوارنے کا خیال آگیا۔ میرے دل میں اسلام کی برتری کوٹ کوٹ کر بھری گئی۔ اسلام جو دنیا کے ہر مذہب سے ارفع اور اعلیٰ ہے۔ یہ بھائی بھائی کا نعرہ اپنی جگہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پھر مسلمان ہے۔ بغدادی قاعدہ بھی شروع کرایا گیا۔ اور الف دوزبران درزیران درپیش ان رٹتے وقت بڑی شدت سے نیند آنے لگتی۔ الفاظ کے ترنم میں لوری کا تاثر ہے اور جب ملانی جی کی قمچی پڑتی تو ساری نیند رفو چکر ہو جاتی۔ ملانی جی' چندھی' بہری اور بلا کی بدماغ تھیں۔ سنا ہے ان کے مرحوم شوہر انہیں چارپائی سے ساندھ کر بھیگی ہوئی رسی سے ان کی چمڑی ادھیڑا کرتے تھے۔ بڑھیانی لفظ ایک دو تھپڑ رسید کرتی تھی۔ کوئی بیس یا بائیس بچوں کو پڑھاتی تھی اور سب کو مستقل چانٹے تھپڑ گھونسے مارتی تھی۔ سوکھی سوکھی انگلیوں سے میری موٹی موٹی رانوں میں ایسی چٹکیاں لیتی تھی اور ہاتھ نہیں ٹوٹتے تھے۔ ہم آیتیں پڑھ پڑھ کر اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ میں نے کبھی کسی انسان سے ایسی شدید نفرت نہیں کی جیسی اس بڑھیا سے کی۔ ساتھ ساتھ اس نے جو کچھ پڑھایا وہ بھی مجھے عذاب الٰہی معلوم ہے۔

بچپن جیسے تیسے بیتا۔ یہ کبھی پتہ نہ چلا کہ لوگ بچپن کے بارے میں ایسے سہانے راگ کیوں الاپتے ہیں۔ بچپن نام ہے بہت سی مجبوریوں کا محرومیوں کا۔ بڑے ہو کر ایک پوزیشن بنتی ہے جو ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتی ہے۔ آٹھ بڑے بھائی بہنوں کی شفقتیں جھیلنے کے بعد بڑے ہونے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ جب گھر میں چھوٹے بھانجے بھتیجے پیدا ہونے لگے تو اپنی بزرگی کا احساس نہایت تسلی بخش ثابت ہوا۔ مساوات کا فقدان امیر غریب کے معاملے میں ہی نہیں عورت اور مرد کے مقابلے میں تو اور بھی زیادہ ہے۔ میرے والد تو روشن خیال تھے۔ اصولاً بھی لڑکوں سے لڑکیوں کے حقوق کا زیادہ خیال رکھتے تھے مگر وہی بات تھی جیسے ہندو مسلم بھائی بھائی لڑکا لڑکی برابر۔ چند نعرے تھے جن کی لیپ پوت نہایت ضرورت سمجھی جاتی تھی۔

یہ میری خوش نصیبی یا بد نصیبی تھی کہ ہوش آیا تو باقی کی تین بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ کئی بھائیوں میں اکیلی لڑکی گھاٹے میں نہیں رہتی اور پھر ذرا بھی میری حق تلفی ہونے کا اندیشہ پیدا ہوتا تو فوراً ابا کے حضور میں مقدمہ پیش کر دیا جاتا۔ میری بہنیں نہایت سگھڑ تھیں۔ اردو فارسی قرآن شریف کے علاوہ کشیدہ کاری بنائی سلائی اور کھانے پکانے میں مشتاق میں نہایت پھوہڑ۔ پتہ مارنے کی عادت نہ دلچسپی بھائیوں کی نقل میں پیڑوں پر چڑھنا سائیکل دوڑانا۔ ہر جگہ مجھے اپنی شکست کا احساس ہوتا۔ بھائیوں کے مقابلہ میں نہایت پھسڈی۔ انہیں بھی مجھ پر ترس کیوں آتا۔ میں ابا کی شہ پر ان کی برابری پر تلی ہوئی تھی۔ باری باری سب کو گھوڑے کی سواری کا موقع ملتا تھا۔ جہاں میں گھوڑے پہ بیٹھی اور بھائیوں نے بڑبڑایا گلی ڈنڈا کھیلتی تو پدتے پدتے بھوسہ نکل جاتا۔ فٹ بال کھیلنے کی ضد کرتی تو سارے کک میری چاند ہی پر پڑتے۔ بھائی میری اس ڈھٹائی سے سخت نالاں تھے۔ میری بڑی بہنوں کی شادی سے پہلے گھر پر حکومت چلتی تھی۔ گودام کی کنجی قبضہ میں رہتی تھی۔ کپڑے سیتی تھی۔ اس لئے بھائی ان کے محکوم رہتے تھے میں تو دردِ سری تھی۔

عظیم بھائی ہمیشہ کے بیمار سے تھے۔ میں لڑکی ہونے کی وجہ سے بھائیوں کے ساتھ نہ نبھا سکتی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے مجبور تھے۔ انہیں کچھ مجھ پر ترس آ گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ لڑکے تو بیل ہیں۔ تم بیل کیوں بنو۔ پڑھائی میں تم ان سے ٹکر لو۔ وہاں تم انہیں مار لو گی۔

پھر انہوں نے مجھے بڑی محنت سے پڑھانا شروع کیا۔ دو بار مجھے ڈبل پرموشن دلوایا۔ اور ایک بار مجھ سے بڑے بھائی فیل ہوئے۔ وہ مجھ سے ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ مگر تین درجے آگے تھے۔ پھر ایک دن ہم دونوں جب ایک کلاس میں آ گئے اور میں نے ان کا ہوم ورک کر کے ان کی مدد کرنی شروع کی تب میں ان سے بڑی ہو گئی۔ عظیم بیگ چغتائی کی شہہ پا کر میں نے قرآن کا ترجمہ حدیثیں اور مسلم ہسٹری پڑھی اور اپنے ابا کے بزرگ دوستوں کے بیچ میں بیٹھ کر اپنی تازہ تازہ

معلومات کا اظہار کرنا شروع کردیا- میری اماں دھک سے رہ گئیں- اور حسب عادت جوتی سنبھالی' مگر ابا کی شہہ پا کر میں نے اپنے والد کے معمر دوستوں کی صحبت میں بہت کچھ سیکھا-

میری اماں کو میری حرکتیں- ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں- میرے انجام کی انہیں بہت فکر تھی- یہ مرد مار باتیں عورتوں کو زیب نہیں دیتیں وہ اتنی گہرائی سے نہ ان کو سمجھتی تھیں اور نہ سمجھا سکتی تھیں مگر مجھے معلوم ہوا کہ میری اماں کیوں ڈرتی تھیں- یہ مرد کی دنیا ہے' مرد نے بنائی اور بگاڑی ہے- عورت ایک ٹکڑا ہے اس کی دنیا کا جسے اس نے اپنی محبت اور نفرت کے اظہار کا ذریعہ بنا رکھا ہے- وہ اسے موڈ کے مطابق پوجتا بھی ہے اور ٹھکراتا بھی ہے- عورت کو دنیا میں اپنا مقام پیدا کرنے کے لئے نسوانی حربوں سے کام لینا پڑتا ہے- صبر' ہوشیاری' دانشمندی' سلیقہ جو مرد کو اس کا محتاج بنا دے- شروع ہی سے لڑکے کو محتاج بناتا کہ وہ اپنا بٹن ٹاکتے شرمائے- روٹی تھوکتے ڈوب مرے- آسان آسان چھوٹے چھوٹے کام جو نوکر کرسکتے ہیں- اپنے ہاتھ سے کرنا اس کی زیادتیوں کو سر جھکا کر سہنا کہ وہ شرمندہ ہو کر قدموں پر گر پڑے-

مگر میں نے تو بھائیوں کے حلقہ میں زندگی گزاری تھی ان کی حرص کی تھی- مصلحت مجھے جھوٹ معلوم ہوتی تھی' صبر بزدلی اور شکر مکاری- میں نے ہاتھ گھما کر کبھی ناک نہیں پکڑی- یہاں تک کہ بننا سنورنا' سنگھار کرنا اور بھڑکیلے کپڑے پہننا بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے عیوب چھپا کر دھوکہ دے رہی ہوں-

"کوئی لڑکا ایسی لڑکی پر جان نہیں دے گا-" میری ہوشیار سہیلیوں نے سمجھایا- سہم کر میں نے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی اور میرے بھائیوں کی بن آئی' تکلف تو رہا نہیں تھا جو الٹی سیدھی بات نہ کہئے- میں صاف گو تو وہ چار ہاتھ صاف گو- میرے پیچھے دھیری لگ گئی- لڑکے پھانسنے کو بھنکنیاں لگا رہی ہوں- بھلا پھر میری کیا مجال تھی جو سولہ سنگھار کر جاتی-

اور تجربہ سے مجھے معلوم ہوا کہ سولہ یا بتیس سنگھار قطعی ضروری نہیں-

مجھے دوستوں کی کبھی کمی محسوس نہ ہوئی۔ یہی دوستیاں اکثر عشق کی حدود کو چھو گئیں۔ روس میں جب میں ایسی لڑکیوں سے ملی جو مصنوعات میں قطعی دل چسپی نہیں لیتیں۔ اور نہایت سیدھے سادھے کام چلاؤ کپڑے پہنتی ہیں تو میں نے ان سے پوچھا وہ سنگھار کیوں نہیں کرتیں۔

"ضروری محسوس نہیں کی، کیوں کیا میں بری لگتی ہوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"نہیں، مگر اور زیادہ اچھی لگو گی۔"

"میں کھرا مال پیش کرنے کی قائل ہوں۔ میری اپنی جلد اپنے ہونٹ میری نسوانیت ہی کافی ہے۔" اس نے بڑے وثوق سے جواب دیا۔

یورپ میں بھی نوجوان طبقہ مصنوعات سے بور ہو چکا ہے۔ عورت اور مرد کے ازلی رشتہ کو قائم رکھنے کے لئے مرد کا مرد اور عورت کا عورت ہونا کافی ہے۔ مجھے روسی لڑکیوں نے بہت متاثر کیا۔ میں نے اپنی کہانیوں میں عورت کی اقتصادی محکومی اور مجبوری کا ہمیشہ رونا رویا ہے۔ ایک لڑکی اگر اپنے وارثوں کا صرف اس لئے حکم مانتی ہے کہ اقتصادی طور پر مجبور ہے تو فرمانبردار نہیں دھوکہ باز ضرور ہو سکتی ہے۔ ایک بیوی شوہر سے صرف اس لئے چپکی رہتی ہے کہ روٹی کپڑے کا سہارا ہے تو وہ طوائف سے کم مجبور نہیں۔ ایسی مجبور عورت کی کوکھ سے مجبور اور محکوم ذہنیت کا انسان ہی جنم لے سکیں گے۔ ہمیشہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کے رحم و کرم پر اکتفا کریں گے۔ جب تک ہمارے ملک کی عورت مجبور لاچار ظلم سہتی رہے گی۔ ہم اقتصادی اور سیاسی میدان میں احساس کمتری کا شکار بنے رہیں گے۔

رشید جہاں نے مجھے کم سنی ہی میں بہت متاثر کیا تھا۔ میں نے ان سے صاف گوئی اور خودداری سیکھنے کی کوشش کی۔

بچپن میں میری ایک اور بڑی پیاری سہیلی تھی۔ ہمارے کوچوان کی بیٹی منگو تھوڑی سی مجھ سے بڑی تھی اور بڑا رعب گانٹھا کرتی تھی۔ تیرہ چودہ برس کی تھی کہ شادی ہو کر لکھنؤ چلی گئی۔ جب اپنی پہلی بیٹی لے کر آئی تو بڑی بجھی بجھی سی ہو گئی

تھی۔ سارا کھلنڈرا پن غائب ہنسی گم۔ لڑکی جننے کے جرم میں اس کی ساس اسے بہت مارتی تھی۔ اور اس کے میاں سے بھی پٹواتی تھی۔

جب وہ تیسری بیٹی لے کر آئی تو ابا پینشن لے کر آگرہ آگئے تھے۔ آگرے کی گھنی فضا میں مجھے عورت کی بے کسی کا تجربہ ہوا۔ پاس پڑوس کی سب ہی عورتیں مدقوق مرجھائی اور شوہروں اور ساس نندوں کی ستائی ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے عورت پنے سے اور بھی گھن آگئی۔

منگو بھی دق کی مریضہ معلوم ہوتی تھی۔ ساس دوسری بہو لانے کے پلان بنا رہی تھی جو بیٹا جن سکے۔ منگو کے ماں باپ رو پیٹ رہے تھے۔ منگو اور اس کی تین بیٹیوں کے سوجھ سے کانپ رہے تھے۔ منگو کی تین روتی بھنکتی لڑکیاں عورت ذات کی نااہلی کا کھلا اشتہار تھیں۔ مجھے خدا کی اس ناانصافی پر غصہ آتا تھا کہ اس نے مجھے بھی لڑکی بنایا تھا۔ میں گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتی تھی کہ اللہ پاک کسی طرح مجھے لڑکا بنادے۔

ابا نے لکھنؤ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کے ذریعہ منگو کے میاں پر زور ڈلوایا کہ وہ اسے بلا لے اور اگر اس پر سوت لایا تو ہتھکڑیاں ڈلوا دی جائیں گی۔ سال بھر بعد جو منگو آئی تو پہچان نہ پڑتی تھی۔ لڑکا بھی نہ جنا تھا۔ پھر بھی چکنی چپڑی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ منگو پر بھوتوں کا سایہ ہو گیا تھا۔ نہایت خطرناک قسم کے مرکھنے بھوت جو منگو کے جسم میں سما کر اسے ورغلاتے تھے اور وہ اپنی ساس کی ٹھکائی کرتی تھی۔ میاں تک کی پنڈلی میں ایک دن کاٹ کھایا۔ سب پر اس کی دہشت بیٹھ گئی۔ بھوت اتارنے والے آئے انہوں نے کہا کہ ساس منحوس ہے اگر بہو اس کے ساتھ رہی تو سات بیٹیاں جنے گی۔ اور سارے کٹم کا ناس ہو جائے گا۔ ساس بے چاری کا پڑا ہوگیا۔ منگو کا میاں اسے اپنی نئی نوکری پر ڈالی گنج لے گیا۔ وہاں وہ صاحب لوگ کے گھوڑوں پر لگ گیا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منگو جاہل اور ان پڑھ تھی۔ بالکل احمق نہ تھی۔ اپنی بساط بھر جو کچھ کر سکتی تھی کر ڈالا۔ عورت کمزور ہو سکتی ہے ناقص عقل ہونا ضروری نہیں۔ میرے دل سے کچھ احساس کمتری نکل گیا۔ لڑکا ہونا

ضروری نہیں، لڑکوں جیسی عقل اور سوجھ بوجھ چاہئے۔ پھر تو میں نے سینا پرونا اور سگھڑاپا دھرا طاق پر اور پڑھنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مذہب ہماری جانوں پر کبھی صرف جنت کی لالچ اور جہنم کا خوف بن کر لاگو نہیں کیا گیا۔ ابا کے دوست ہر خیال اور عقیدے کے تھے۔ ان کی باتیں سن کر بہت سے وہم اور وسوسے دل سے دور ہو گئے۔ ہر انسان اپنی قبر میں جائے گا۔ اپنے خدا سے خود بھگتے گا۔ دنیا کا بھی کوئی خاص خوف نہ تھا۔ مغل ویسے ہی سر پھرے اور جھکی ہوتے ہیں اور ہمارا خاندان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ وہیں ساری دنیا سمٹتی نظر آتی تھی۔ ہر شخص اپنی چمڑی میں مگن اور خود مختار۔

لڑکوں کے لئے یہ عام رویہ مناسب سمجھا جاتا ہے، میں لڑکی تھی۔ اماں، خالائیں، پھوپھیاں، چچیاں ہیبت زدہ تھیں۔ عورت ذات کو یہ منہ زوریاں زیب نہیں دیتیں۔ سسرال میں کیسے گزر ہو گی۔ سماج نے عورت کا ایک ٹھکانا مقرر کر دیا ہے۔ اس سے باہر قدم رکھا تو پیر چھانٹ دیئے جائیں گے۔ زیادہ تعلیم بھی بلائے جان ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں قول و فعل پر پابندی نہیں تھی مگر یہ شرط صرف مردوں تک تھی۔ مجھے ان حرکتوں پر ڈانٹ کھانی پڑتی تھی۔ پتہ نہیں عظیم بھائی کو کیا مزہ آتا تھا۔ وہ مجھے اور شہہ دیتے تھے۔ شام دفتر سے آ کر اب بھی وہ مجھ سے گھنٹہ دو گھنٹہ ادھر ادھر کی باتیں کیا کرتے تھے۔ بقول کسے مجھے بھڑکایا کرتے تھے۔ انہوں نے سنجیدہ و خشک مضامین چھوڑ کر کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھیں۔ جو کام وہ سنجیدہ مضامین سے نہ کر پائے۔ ان کہانیوں نے کر دکھایا۔ ان کی ہیروئن ایک نہایت شریر اور دلچسپ لڑکی کی مثالی صورت اختیار کر گئی۔ ان سے میں نے سیکھا کہ اگر کچھ کہنا ہے تو کہانیوں قصوں میں لپیٹ کر کہو۔ کم گالیاں ملیں گی۔ زیادہ لوگ پڑھیں گے اور متاثر ہوں گے۔ کہانیاں لکھنے سے پہلے میں نے کئی مضامین لکھے جو چھپے بھی مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ دو چار ہی کہانیاں لکھی تھیں کہ لے دے شروع ہو گئی۔ جیسے ٹیلی فون پر آپ جو چاہے کہہ دیجئے گا کوئی تھپڑ نہیں مار سکتا۔ ویسے ہی کہانیاں میں کچھ ہی لکھ ماریئے کوئی ہاتھ آپ کے گلے تک نہیں پہونچے گا۔ دوسرے مجھے

شروع میں لوگوں کے رد عمل کا پتہ بھی نہ تھا۔ صرف ساقی میں لکھتی تھی۔ ان کے
پاس جو خط میرے نام آئے تھے وہ انہیں ضائع کر دیتے تھے۔ بد قسمتی سے "لحاف"
وہ پہلی کہانی تھی جو عین شادی کے بعد چھپی اور شاہد احمد صاحب نے اب مجھے ذمہ
دار سمجھ کر سارے خطوط حفاظت سے میرے سپرد کر دیئے۔ ان خطوط کا لہجہ اتنا
بھیانک تھا کہ پہلے تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں نے سہم کر اپنے قلم کی لگام کھینچی
اور اپنی دانست میں تو میں نے اس کے بعد ڈھیل نہیں چھوڑی لیکن برا ہوا اس
ماحول کا جہاں میں نے پرورش پائی۔ دھڑلے سے بات کہنے کی عادت نہیں چھوٹی
اور لوگ جھلا کر گالیوں پر اتارو ہو جاتے ہیں، تو مجھے ان سے کوئی ذاتی عناد نہیں
ہوتا۔ بہت سی مار پیٹ نوچ کھسوٹ کے بعد پھر مل بیٹھنے کی عادت رہی۔ کبھی چٹکی
لینے میں مزہ آتا ہے اگر کوئی پلٹ کے پتھر دے مارے تو اس سے بغض نہیں پیدا
ہوتا۔

زندگی میں سب سے زیادہ مجھے کتابوں نے متاثر کیا ہے۔ مجھے ہر کتاب سے
کچھ نہ کچھ ملا ہے اپنی زیادہ تر الجھنوں کا جواب ان ہی میں ڈھونڈا اور پایا ہے۔
کتابیں قریب ترین دوست اور غمگسار ثابت ہوئی ہیں۔ ہزاروں محرومیاں ان ہی
دوستوں کے سہارے جھیلی ہیں۔ ہر کتاب کے مصنف کو میں نے ایک قسم کا رشتہ
دار سا محسوس کیا ہے۔ نام کہاں تک گناؤں۔ ہارڈی، براؤنٹی سسٹرز سے شروع کر
کے برنارڈ شا تک پہونچی۔ مگر روسی ادیبوں نے زیادہ متاثر کیا کہ جب عقل و ہوش
کو کسی راہبر کی تلاش تھی۔ تب ان کتابوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ پولیٹیکل، فلاسفی خشک
مضمون رہی اور روسی ادب ذہن کے کونے کونے میں جذب ہو گیا۔ چیخوف کو تو میں
آج بھی برکت کے لئے آموختہ کے طور پر پڑھتی ہوں۔ جب کوئی کہانی قابو میں
نہیں آتی، پتہ نہیں چلتا کہاں سے شروع کروں کہاں ختم کروں تو میں دماغی ورزش
کے لئے چند کہانیاں چیخوف کی پڑھ ڈالتی ہوں۔ ایک دم ذہن پر دھار سی رکھ جاتی
ہیں اور قلم چل نکلتا ہے۔

پڑھنے کے بعد باتوں کا نمبر آتا ہے۔ ہمارا خاندان نہایت بکو ہے جب دو چار

ل بیٹھتے ہیں تو بس ہوش ہی نہیں رہتا چلتے پھرتے کھاتے پیتے بکتے جا رہے ہیں۔ ایک صاحب مجبوراً" غسل کرتے جا رہے ہیں۔ مباحثہ میں حصہ لیتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کھڑکی سے سر نکالتے ہیں صابن ملتے جاتے ہیں۔ اور باتوں کا سلسلہ چلائے ہوئے ہیں۔ مجھے ہر انسان سے بات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ دوکانداروں سے سودا سلف والوں سے ٹیکسی والوں سے یہاں تک بھیک مانگنے والوں سے۔ بڑھیوں بڈھوں کو چھیڑ کر ان کی ملامتیں گالیاں سننے میں بھی عجب لطف آتا ہے۔ تعلیم یافتہ عالم فاضل ہونے کی کوئی شرط نہیں۔ نہایت جاہل اور سیدھے سادھے انسانوں سے بات کر کے بعض وقت دماغ میں کھڑکیاں کھل جاتی ہیں۔ انسان کو پہچاننے کے لئے اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ بات کرنے کی اتنی پریکٹس ہو گئی ہے کہ پانچ منٹ میں پوری زندگی کا خلاصہ ہاتھ آ جاتا ہے۔ بس چند نہایت سیدھے سادھے مختصر سے سوال پوچھ لیجئے۔ ملاقات بھرپور طریقہ پر ہو جائے گی۔

باتیں کرنا دلچسپ ترین مشغلہ ہے۔ صفیہ جاں نثار سے تو اس کی مختصر سی زندگی میں اتنی باتیں ہوئیں کہ اوروں سے برسوں مل کر بھی نہ ہو پائیں۔ منٹو سے باتیں کر کے احساسات پر دھار آ جاتی تھی۔ چھ چھ سات سات گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے تھے۔ ان کی بیوی صفیہ بھی ایک باتونی عورت ہے۔ سلطانہ جعفری سے تو بس گپیں ہوتی ہیں۔ سردار جعفری سے کج بحثی اور جملہ بازی میں مزہ آتا ہے۔ جن لوگوں نے سردار سے بات کی ہے انہیں اندازہ ہو گا کہ جتنی تلخی ترشی اور کاٹ اس شخص کی زبان میں ہے۔ جلانے پر آئے تو بھون کے رکھ دے۔ ایک زمانہ تھا جب محفلوں میں جس کی شامت آ جاتی۔ سردار اسے رلا کر ہی دم لیتے۔ بس چوکھی چوٹوں پر چوٹیں۔ جب سے بیمار ہوئے ہیں محفلیں کچھ بجھی بجھی محتاط سی ہو گئی ہیں۔ قدسیہ زیدی سے باتیں کر کے جی ہی نہیں بھرتا تھا۔ اب ان کی بیٹی شمع سے باتیں کرتی ہوں۔ تو ان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ سلمہ صدیقی سے بس دو باتیں کر لو کام و دہن معطر ہو جائے گا۔ عینی انتہائی پکی واقع ہوئی ہیں۔ نہایت سرپٹ بولتی ہیں

جیسے بولنے کو بہت ہے وقت بھاگا جا رہا ہے۔

مگر صاحب باتوں کے معاملے میں میری ماموں زاد بہنوں اختر اور جمیلہ کا کوئی جواب نہیں۔ ان کے مقابلے میں عام طور پر لوگ گونگے معلوم ہوتے ہیں۔ ان سے گھنٹوں باتیں کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے میری زبان پر سے سارا زنگ کھرچ گیا۔ آپ ہی آپ جملے ہونٹوں پر سے پھسلنے لگتے تھے۔ ٹوٹے ادھورے کٹے کٹے جملے مگر معنی سے بھرپور ان کی زبان میں اپنی ننھیال کے ناطے دلی کی بیگمات کی میٹھی بولی کا عجیب لٹکا ہے۔ میری کہانیوں میں مکالمے ان ہی کی زبان سے نکلے ہوئے ہیں۔ پڑھنے' بکواس کرنے کے بعد لکھنے کی باری آتی ہے۔ فارسی ہمارے خاندان کی مادری زبان سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے تایا فارسی کی حمایت میں اکیلے سپاہی کی طرح ہمیشہ دیوار پاکھوں سے لڑتے رہے۔ اپنے بیٹوں کو انہوں نے انگریزی تعلیم قطعی نہیں دی۔ فر فر فارسی بولتے' پڑھتے اور لکھتے تھے مگر کسی نوکری میں نہیں کھپے۔ قلاش مرے۔ پھر بھی انہیں ضد تھی کہ سب بھتیجوں کو بھی فارسی ہی پڑھائی جائے۔ ہمارے ابا جو ان کی ہر بات پر صاد کر دیتے تھے اس بات پر اڑ گئے۔ لڑکوں کو نہیں ہاں لڑکیوں کو فارسی پڑھایئے' کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب بڑی تین بہنیں فارسی پڑھ کر بیاہی جا چکی تھیں۔ تختہ مشق بننے کے لئے خاکسار ہاتھ آئی۔ بھائیوں نے اس فیصلے پر اپنی برتری مانی اور مجھے مدفاضل قرار دے کر اتنا چڑایا کہ فارسی میری چڑھ ہو گئی مگر تایا ابا کو سوائے نماز پڑھنے کے اور مجھے فارسی پڑھانے کے کوئی کام نہ تھا۔ لہٰذا وہ جیتے اور میں ہاری۔ "پڑھو فارسی بیچو تیل" بھائی جلے پر تیل چھڑکتے اور میں آنسو بہاتی جاتی' فارسی رٹتی جاتی۔ جونہی میرا بس چلا میں نے فارسی سے بغاوت کر دی' مگر جب تک تایا ابا اتنی پڑھا چکے تھے کہ بعد میں اپنے شوق سے جب قدیم اور جدید فارسی ادب پر طائرانہ نظر ڈالنے کا موقع ملا تو زبان مانوس معلوم ہوئی اس وقت تایا ابا کا انتقال ہو چکا تھا اور میں ان کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکتی تھی۔ پھر بھی انجانے طور پر مجھے فارسی الفاظ کے استعمال میں تکلف رہتا تھا۔ دوسرے جو زبان گھر میں بولی جاتی تھی اتنی سرپٹ تھی کہ کہانیاں لکھتے وقت

کبھی رک کر سوچنے کی قباحت نہیں ہوئی۔ انسان اپنے ہر خیال کا اظہار روزمرہ کی بولی میں کر سکتا ہے تب میری زبان ہندی سے زیادہ قریب تھی۔ کیوں کہ ہندی جب اتنی گاڑی نہیں ہوئی تھی۔ نہایت رواں اور میٹھی زبان تھی جو اب دلی اگرہ کی عورتوں کے لبوں پر زندہ رہ گئی ہے۔

لکھنے میں میں نے ہمیشہ پڑھنے جیسا لطف محسوس کیا۔ میں نے اپنی زندگی کے نہایت دلچسپ اور نہایت ہی کٹھن لمحے لکھنے کے سہارے جھیلے ہیں۔ کتنے بوجھ اتارے ہیں اور کتنے چڑھائے ہیں۔ یہ قلم میرا رزق بھی ہے اور ہمدم' ہمراز بھی۔ تنہائی کا بولتا چالتا دوست بھی۔ اس کی موجودگی میں میں نے کبھی اکیلا پن محسوس نہیں کیا۔ میں جب چاہوں اس اڑن کھٹولے کے ذریعے سے جسے چاہوں بلا لوں۔ اور جب وہ آجائیں تو جو جی چاہے ان سے کہوں۔ ہنساؤں' رلاؤں یا جی جلا کر خاک کر دوں۔ پھر موڈ آجائے تو پرزہ پرزہ کر کے فنا کر دوں۔ کٹھ پتلیوں کی طرح پتلے بنا کر جیسے چاہوں نچاؤں۔ اس وقت مجھے ایک خالق کی سی تقویت محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ بتانے لگوں کہ مجھے کسی نے متاثر نہیں کیا تو آسان ہو گا۔ زندگی میں جس سے بھی واسطہ پڑا اس نے اپنا نقش دماغ پر چھوڑا۔ عظیم بھائی کے بعد میرے دوست سہیلیاں' استاد اور راہ چلتے ملنے والے' ڈاکٹر اشرف نے کتنے ہی سوالوں کو سلجھایا۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما نے بکھرے ہوئے تاروں کو جوڑ کر ایک سلسلہ قائم کرنے میں سہارا دیا۔ کرشن چندر کی کہانیوں میں عجیب عجیب نازک پیکروں سے ملاقات ہوئی۔

فضل الرحمان پرو وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی سے تو جب بھی ملتی ہوں۔ انہیں ڈکشنری کی طرح استعمال کرتی ہوں۔ کسی بھی ڈرامہ یا شعر کا حوالہ دے دیجئے' پھر وہ سناتے چلے جائیں گے۔ انہوں نے انجانے طور پر مجھے بہت پڑھایا ہے۔ شاہد لطیف سے شوہر کے علاوہ ایک اور رشتہ تھا۔ جب دوستی کے موڈ میں آ جاتے تھے تو بہت گھٹتی تھی۔ گو شادی دوستی کی موت ہے مگر ہماری دوستی نے بڑی ڈھٹائی سے ساتھ دیا۔ میری تمام ناولوں اور کہانیوں پر وہ نظر ثانی کیا کرتے تھے کبھی انہیں بتانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر ان سے چھپا کر میں ان کی رائے کو بہت اہمیت

دیتی تھی، پکڑ لیتے تھے تو بہت رعب گانٹھتے تھے۔

بچوں کی ناول تین اناڑی میں میں نے اپنے تین بھتیجوں کو بجنسہ اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ اگر اسے ان کی سوانح عمری کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

علی گڑھ میں ہمارے خاندان دھوبی ننھا رام میرے خاصے گہرے دوست ہیں۔ جب جاتی ہوں خود کپڑے لینے آتے ہیں۔ گھنٹوں اکڑوں بیٹھے گپیں مارا کرتے ہیں۔ میں نے ان کی زبان سے وہ کہانیاں سنی ہیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔ زیادہ تر اپنی لرزتی ہوئی بوڑھی آواز میں کتھائیں گا کر سناتے ہیں۔ چاندی کی انگوٹھی والی انگلی سے چوکھٹ پر تال دیتے جاتے ہیں۔ منکارے سے میوزک پیس بھی لگاتے جاتے ہیں۔ ان کے گرد ایک سقہ ہیں جو بہت گیانی ہیں۔ بیچ بیچ میں گرو کے اقوال دہرائے جاتے ہیں۔ الہہ دول بڑی دھوم سے سناتے ہیں۔ پانچ روپیہ فیس اور ایک روپیہ آن جانے کا رکشا کا کرایہ وصول کر کے چار پانچ گھنٹے سنا جاتے ہیں۔ پوچھو تو ٹھیٹ برج بھاشا میں تشریح بھی کر دیتے ہیں۔ میں نے ان کی طبقہ کی زبان ان ہی سے سیکھی ہے۔

کالج میں مختلف مذاہب کے بارے میں ڈاکٹر ٹکر کی کلاس میں لیکچر سننے کے بعد ان کی رہنمائی میں بہت کچھ پڑھنے کا موقع ملا۔ مذہب کے بارے میں جو کچھ جالے دماغ پر تن گئے تھے صاف ہو گئے۔ بدھ مذہب نے بے حد متاثر کیا۔ بی اے کرنے کے بعد جائیداد کے سلسلے میں اپنے آبائی وطن آگرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ معلوم ہوا دوسرے دن سوشی میری بچپن کی گوئیاں کی شادی ہے۔ سارے گھر کا بلاوا آیا ہے۔ مجھے تعجب ہوا۔ لالہ جی جیسے تنگ خیال کٹر انسان سے میرے بھائی کا لین دین کیسے قائم ہے۔ میں خود تو تمام بندھن توڑ کر ایک ایسے مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں انسانیت ہی واحد خدا رہ جاتا ہے۔ میرا اور سوشی کا کیا جوڑ۔ سوشی فراڈ ہے جس سے ماں باپ نے پلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی کو خدائے مجازی بناتے کو تیار ہو گئی۔ مجھے وہ جنم اشٹمی والا دن یاد تھا گو اس کے بعد آگرہ چھوٹ چکا تھا اور ہم لوگ علی گڑھ چلے گئے لالہ جی کو پتہ چلا تو جھٹ سے چھوٹے بیٹے سریش کو

بھیجا۔ میں نے ٹالنا چاہا۔

"شام کو آؤں گی۔"

"دیدی کہتی ہے بس دو گھڑی کو آ جاؤ پھر رسمیں شروع ہو جائیں گی تو بات نہ ہو سکے گی۔" سریش پیچھے پڑ گیا۔

میں گئی تو سوشی ہلدی لگائے اسی کمرے میں بیٹھی تھی جہاں ایک دن بھگوان کرشن کا جھولا سجایا گیا تھا۔ جہاں سے مجھے بیک بنی اور درگوش نکالا گیا تھا۔ جی چاہا الٹے قدم واپس چلی آؤں مگر مجھے دیکھ کر وہ لپکی۔

"کیسی ہے ری عصو" اس نے میرا پیار کا نام لے کر پکارا۔ بچپن کے ساتھ یہ نام بھی کہیں دور چھوڑ آئی تھی۔ عجیب سا لگا۔ جیسے وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہو رہی تھی۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر گھسیٹا اور کنڈی چڑھا دی۔ باہر نانی ماں بڑبڑا رہی تھی۔

"ایسے سمٹے ہر کوئی آنا جانا ٹھیک نہیں۔"

وہ دیر تک بھری بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میری جھوٹی پر تکلف مسکراہٹ سے اس نے دھوکہ نہیں کھایا۔ اس نے شرارت سے مسکراہٹ دبا کر دیکھا، جیسے روٹھے ہوئے بچے کو دیکھتے ہیں۔

"ہائے رام کتنی لمبی تاڑ کی تاڑ ہو گئی۔" پھر بھی دیوار میں کوئی شگاف نہ ملا تو اس نے الماری کھولی اور مٹھائی کی تھالی نکالی۔ میں لڈو ہاتھ میں لینے لگی کہ باہر جا کر کوڑے میں پھینک دوں گی۔ جو ہم سے چھوت کرے ہم اس کا چھوا کیوں کھائیں۔

"اہنک، منہ کھول۔"

میں نے مجبوراً" تھوڑا سا لڈو کتر لیا۔ باقی کا بچا ہوا لڈو سوشی نے منہ میں ڈال لیا تو وہ بھی نہیں بھولی تھی۔

دیوار نے بانہیں کھول دیں۔ دیر تک ہم سر جوڑے بچپن کی سہانی حماقتوں کو یاد کر کے ہنستے رہے۔ چلتے سمٹے سوشی نے ایک ننھا سا پیتل کا گھٹنوں چلتا بھگوان

کرشن کا مجسمہ میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"لے چڑیل! اب تو تیرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی۔"

میں مسلمان ہوں۔ بت پرستی شرک ہے۔ مگر دیومالا میرے وطن کا ورثہ ہے۔ اس میں صدیوں کا کلچر اور فلسفہ سمویا ہوا ہے۔ ایمان علیحدہ ہے۔ وطن کی تہذیب علیحدہ ہے۔ اس میں میرا برابر کا حصہ ہے جیسے اس کی مٹی دھوپ اور پانی میں میرا حصہ ہے۔ میں ہولی پر رنگ کھیلوں' دیوالی پر دیئے جلاؤں تو کیا میرا ایمان متزلزل ہو جائے گا۔ میرا یقین اور شعور کیا اتنا بودا' اتنا ادھورا ہے کہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔

اور میں نے پرستش کی حدیں پار کرلیں۔

غرض کوئی کہاں تک لکھے۔ کھلی آنکھیں' کھلے کان کیا کیا دیکھتے سنتے ہیں۔ دماغ میں ایک نکتہ سا لگ جاتا ہے۔ یہ نکتے جڑ کر الفاظ کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔ الفاظ سے عمارت کی لڑی بنتی ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نکتے کے موتی کی جگہ زخم لگتا ہے۔ زخم سے زخم جڑ کر لفظ نہیں بنتا۔ عبارت کی لڑی نہیں سنورتی' ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جب ہندو مسلم فساد کی ملک کے کسی حصے سے خبریں آتی ہیں تو میرا قلم منہ چڑھاتا ہے۔ اور سوشی کا کھلایا ہوا لڈو حلق میں ہی زہریلا کانٹوں دار گولا بن کر پھٹنے لگتا ہے۔ تب میں الماری میں رکھے ہوئے بال کرشن سے پوچھتی ہوں۔

کیا تم واقعی کسی منچلے شاعر کا خواب ہو؟ کیا تم نے میری جنم بھومی پر ہی جنم نہیں لیا۔ بس ایک وہم ایک آرزو سے زیادہ تمہاری حقیقت نہیں۔ کسی مجبور اور بندھنوں میں جکڑی ہوئی ابلا کے تخیل کی پرواز ہو کہ تمہیں رچنے کے بعد اس نے زندگی کا زہر ہنس ہنس کر پی لیا۔

کیا تم اس دھرتی کے حلق میں اٹکا ہوا تیر نہیں نکال سکتے؟

مگر پیتل کا بھگوان میری حماقت پر ہنس بھی نہیں سکتا کہ وہ دھات کے خول میں منجمد ہو چکا ہے۔ سیاست کہ دنیا کا سب سے منافع بخش پیشہ ہے' دنیا کا خدا

ہے۔ سیاست کے میدان میں کھائی ہوئی مات کے سیاہ دھبے معصوموں کے خون سے دھوئے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کی نااہلی ثابت کرنے کے لئے انسانوں کو کتوں کی طرح لڑایا جاتا ہے۔

کیا ایک دن پیتل کا یہ خوش توڑ کر خدا باہر نکل آئے گا۔
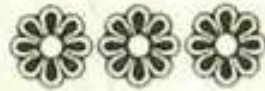
اف یہ بچے

میں نے سجے سجائے کمرے پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی اور ذرا پرے ہٹ کر ایک چوکی پر بیٹھ گئی جسے میں نے چادر منڈھ کر نہایت فیشن ایبل "دیوان" میں تبدیل کر دیا تھا۔ دو ایک کشن ادھر ادھر کیے اور پردوں کی چنٹ کو پھر سنوارا۔ آرام کرسیوں کو ذرا یورپی کھڑکی کی طرف سرکایا اور میز پوش کے کونے ذرا اور نیچے کھینچ دیئے۔ اب مس فلپ نہیں ان کے فرشتے بھی بے کہے سنتے آ دھمکتے تو مجھے خوف نہ تھا۔ دوپٹہ اتار کر کرسی کے ہتھے پر ڈال دیا اور رسالوں کے انبار میں سے کرید کر ایک موٹا سا باتصویر رسالہ نکال لیا اور احتیاط سے پلنگ پر لیٹ گئی۔ مادھوری کی دلکش آنکھیں.... دیوکا رانی کا چھلوں دار جوڑا۔ مسز سروجنی نائیڈو کا شان دار بازو ہٹلر کی دلفریب مونچھیں۔ غنودگی کی وجہ سے ذرا دھندلی دھندلی نظر آنے لگیں۔ خاؤ---- میں نے جمائی کو روک کر ان پانچ تمام بچوں کے چوکھونٹے چہروں کو دیکھا جو ڈبوں کی طرح ایک قطار میں آراستہ تھے۔

"پانچ!" میں نے چپٹی ناکوں کو بھنگیا سے گنتے ہوئے سوچا "ایک دم" دوسرا خیال آیا۔ "شاباش ہے بچی تیرے جوڑے پر۔ تیرا ہی بوتا تھا کوئی اور وال کی ہوتی تو سانس بھی نہ لیتی۔ پانچ پورے پانچ! معجزہ ہے۔"

قدرت سے بھول ہو گئی۔ کچھ ہاتھ بہک گیا۔ سنتے ہیں ایک بھینس کے کبوتر کے بچے پیدا ہوئے! کیا خبر بن سنتے ہیں یہ آنکھوں کے نور' دل کے سرور کچھ اسی شان سے نزول فرما رہے ہیں۔ بھئی بچوں کے دم سے ہی گھر کی رونق ہے۔ دروازے میں بے تکی سی کھسر پھسر ہوئی اور مجھے چونکنا پڑا۔ جب سے چنو کی کتیا نے بچے دیئے تھے ہمیں ذرا ہشیار ہی رہنا پڑتا تھا۔ گھر کے ہر کونے میں موٹے موٹے پلے کوں کوں کرتے پھرتے تھے۔ ناک میں دم تھا۔ کبھی برتنوں کی ڈلیا میں سو

رہے ہیں تو کبھی سل پر ہتھیلیاں کھیلی جا رہی ہیں، تو کبھی میلے کپڑوں میں کشتی ہو رہی ہے تو کبھی کچھ! میں نے آہستہ سے دلائی میں منہ چھپا لیا اور ہلکے ہلکے جھک کر جوتا اٹھا لے گئی کہ بس آتے ہی دوں ایک کس کی۔ دوروازہ کھلا، پردہ ہلا۔ میں نے جوتے کو ذرا زور سے دابا۔ ارے مینو! خیر ہو گئی ورنہ لینے کے دینے پڑ جاتے۔ جوتا چھوڑ کر میں واپس لیٹ گئی۔ مینو جسے میں نے صبح ہی بمشکل کمرے سے نکالا تھا پھر آ گئی۔ لیکن خیر کیا ہرج ہے۔ ہرج ہی کیا ہے۔ جاگ تو رہی ہوں۔ کچھ بگاڑے گی تو دیکھا جائے گا۔ وہ آگے بڑھ کر کرسی کی آڑ میں آ گئی۔ کمرے میں سکوت طاری تھا۔ نیند نے پھر آنا شروع کیا۔ ایک بچے کی موجودگی میں نیند آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ بھلا کوئی کیسے سو سکتا ہے وہ بھی ہیں اللہ کی پیاری بندیاں جو کلیجہ سے بچوں کو چمٹا کر غافل سو سکتی ہیں۔ نیند تو سولی پر بھی سنتے ہیں آ ہی جاتی ہے۔ خاموشی برابر طاری رہی۔ غنودگی بڑھ کر غفلت میں ڈوب گئی۔

عجیب طلسمی آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔ "ارے!" یقین مانیئے میری گھگی بندھ گئی۔ ایک غیر فانی ہیولا جو کسی طرح بھی ایک بڑی لومڑی سے اونچا نہ ہو گا۔ میرے سرہانے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل ایک حیرت انگیز قلابازی کھانے کو تیار تھا۔ میرے تعجب سے اچھلنے پر وہ شے ایک دم کچھ ایسے پلٹی کہ اس کی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی ٹانگیں مع دو تر بتر جوتوں کے میرے منہ اور تکیہ پر پڑیں۔

"ای ہی ہی" وہ شے ہنسی۔

لاحول ولا قوۃ مینو" میں بھی کس قدر ڈرپوک ہوں۔ میں نے سوچا۔

"اونہوں، اتر نیچے" میں نے کیچڑ، پانی اور صابن سے لتھڑی ہوئی بچی کو نیچے دھکیل کر اتارا۔ ذرا حواس درست ہونے پر کچھ عجیب قسم کی پاؤڈر، صابن، منجن اور دیگر لوازمات کی بو، کیچڑ کی سوندھی خوشبو میں مل کر کمرے کو معطر کرنے لگی۔

اور یہ واقعہ تھا کہ سنگار میز پانی پت کا میدان بنی ہوئی تھی۔ کریمو زون! وہ حیرت انگیز کریم جسے اگر حبشی بھی استعمال کرے تو تین دن میں خاصا گورا پڑ جائے، جو میں نے ڈھائی روپے خرچ کر کے سپلائی کمپنی سے دو روز ہوئے منگوائی تھی جسے

میں مارے کنجوسی کے صرف گالوں اور ناک پر چپڑ لیا کرتی تھی۔ نہایت دریا دلی سے آئینہ، میز اور خود مینو کی تھوتھنی پر لپٹی ہوئی تھی۔ دانتوں کے چودہ آنے والے برش سے بوٹ پالش کی شیشی کی زیریں تہہ نکال کر کنگھے اور برش پر پوتی گئی تھی "کوٹی" کا بہترین رنگ والا پاؤڈر میز کے اوپر چاروں طرف چھڑکا گیا تھا۔ کیوٹکس کی دونوں شیشیاں کہنیوں تک مینو پر روغن کرنے میں خالی کی جا چکی تھیں لیکن جس چیز نے میرا خون خشک کر دیا وہ میرا خوب صورت "ڈچز سیٹ" تھا جسے میں نے لاہور کی نمائش میں ساڑھے پانچ روپے میں خریدا تھا اور آج ہی مس فلپ کی عزت افزائی کیلئے بچھا دیا تھا۔ صابن اور ابٹنے میں لتھڑا ہوا نہانے کی چوکی پر رکھا ہوا تھا۔

سمجھ میں نہ آیا کیا کروں۔ مینو میری نظریں بھانپ گئی اور چلی کتراتی ہوئی۔

"ٹھہر تو موئریا۔ چلی کہاں" میں نے دانت بھینچ کر اسے ہاتھ پکڑ کر گھما ڈالا۔ اور ایک میز پر بٹھا دیا جس کا میز پوش وہ پہلے ہی بالٹی میں بھگو آئی تھی۔

"آں ---- چھوڑیئے" وہ اترا کر تتلائی۔

"ہوں!" میں نے میز پر سے یہ موٹا سا رول اٹھا کر اسے دھمکایا۔ "بول اب۔"

"آں ---- ہم امی سے کہہ دیں گے" وہ مچلنے لگی۔

دیکھوں تو تیری امی کو" میں نے اسے گال پکڑ کر کھینچا۔

"دوامی ---- دیکھئے' آں ہٹ" میں نے گھونسہ دیا۔

"دوامی۔ ی۔ ی۔ ی۔ دیکھو مار رہیں ہیں" وہ کچھ اور وصول کرنے سے پہلے ہی چلائی۔

"بھئی کیا آفت ہے ---- کیوں کھائے لیتے ہو میری بچی کو' دوامی کہیں سے چلائیں۔

اے ہے بس آگ ہی تو لگ گئی۔ اب کے جو وہ ڈکرائی تو ننگے پیر صرف پیٹی کوٹ پہنے وہ امی صاحبہ سوتے سے بھاگ آئیں۔

"سب ہی میری بچی کو مارتے ہیں۔ ہٹو بھی" وہ بھنبھنائیں۔
"ہوں اور یہ تمہاری منحوس بچی چاہے کسی کو قتل کر ڈالے کچھ نہیں۔" میں نے کہا۔
"واہ میری بچی کیوں ہوتی۔ آخر بات بھی تو ہو کچھ۔"
"یہ --- یہ کچھ بات ہی نہیں --- بات ہی نہ ہوئی --- یہ دیکھو --- یہ دیکھو۔" میں نے اشارے سے انہیں وہ دردناک منظر دکھایا۔
"اوئی" وہ مسرت کو دبا کر بولیں "اے ہے وقت کی نزاکت دیکھ کر وہ بے تحاشہ ہنسنے سے باز رہیں۔ جب کوئی کسی کا نقصان کر دے بڑے ابا پھسل کر گر پڑیں۔ کسی کے بھڑیں لپٹ جائیں یا ان کا بچہ کچھ بگاڑ دے تو دوامی کو ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے وہ اپنی ناک پر آنچل رکھ کر لوٹ لوٹ جاتی ہیں۔ یہی ہوا کہ وہ کھلکھلائیں اور میں سلگی۔
میں آگے بڑھی۔
اے ہے تو کیا اس ڈنڈے سے مارو گی۔" وہ سیاہ رول کو دیکھ کر کانپیں۔
"ہاں! اور جب یہ ٹوٹ جائے گا تو مسہری کا بانس لے لیں گے۔" میں نے اطلاع دی۔
"اے چلو بھی دیوانی ہوئی۔ لاؤ میری بچی کو۔ میں نہلاؤں۔ وہ آگے بڑھ کر فرمانے لگیں۔
"اب ایک دم ہی آخری دفعہ نہلا لینا۔" میں نے رول ہلایا۔
"اس کے دشمن نہائیں آخری دفعہ۔ چلو چھوڑو" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچا۔
"جی نہیں آج اس پر ٹھیک طرح مار پڑے گی۔"
"بھلا مارنے سے کیا ہو گا۔" دوامی چہرے پر بھولپن لا کر بولیں۔
"ہمارا کلیجہ ٹھنڈا ہو گا۔"
"خاک پڑے تمہارے کلیجہ پر کیہ بچی کو مارنے سے ٹھنڈا ہو گا" وہ بگڑیں۔

اور ہم دونوں مینو کو ہوا میں معلق کر کے اپنی اپنی طرف تاننے لگے۔ وہ بولی "چیں۔"

"اے چھوڑو میری لونڈیا کا ہاتھ اتر جائے گا واہ" وہ غرائیں۔

"میری بلا سے ہاتھ ٹوٹ جائے۔ پھر تو یہ میرے کمرے میں نہ آئے گی۔" میں نے جھنجھوڑا۔

"اے بنو تم دام لے لینا۔ کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں؟"

"کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں؟" میں نے جل کر منہ چڑایا کتنے کی بھی تھیں۔ ہم دام نہیں لیتے۔ ہم تو آج اسے جی بھر کے دھنیں گے۔ یہ آتی ہی کیوں ہے یہاں؟"

"اللہ اب چھوڑو گی بھی۔ چلو اب تمہارے کمرے میں تھوکے گی بھی نہیں اور بھئی کہہ تو دیا دام لے لو اور کیا کروں۔" دلہن بھابھی لاچاری پر اتر آئیں۔

"دام لے لو۔ تم یہ بکے جا رہی ہو۔ یہ نہیں دیکھتیں اس نے کیسا ستیاناس کیا ہے میرے کمرے کا" میں نے نرم ہو کر کہا۔

"اچھا بھئی اب نہیں کرے گی۔ اب کے آجائے تو جی چاہے جتنا مار لینا۔۔۔ بس!

"اچھا اب کے تو ملزمہ تمہاری ضمانت پر چھوڑی جاتی ہے اگر اس کا چال چلن....."

"ذرا ہوش میں۔ واہ بڑی آئیں میری بچی کے چال چلن کو کہنے والی۔ اوئی ٹوٹا میری بچی کا گلا" انہوں نے اس کا گال میری گرفت سے گھسیٹ کر چھڑا لیا۔

"اب کبھی نہیں آئے گی وہ" انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔

"ہم کبھی نہیں آئیں گے۔" مینو شیر ہو گئی۔

"ٹھہر تو جا" میں نے رول لے کر دھمکایا اور بھاگیں دونوں بے حیائی سے ہنستی ہوئی۔

اف یہ بچے! بھلا کوئی کاہے کا سگھڑاپا دکھائے اور کیسے؟ جس اجڑے گھر میں کچھ نہیں تو ڈیڑھ درجن بچے موجود ہوں کیسے کچھ کرے، لوگ کہنے کو تو ہو جائیں گے کہ اوئی ذرا پڑھی لکھی لڑکیوں کی حالت تو دیکھو۔

کہو بھلا نصیبوں جلی پڑھی لکھی لڑکی کیا کرے۔ بچے سے بچے ہیں گھر میں۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، ڈیڑھ درجن سے کیا کم ہوں گے۔ ہر قوم اور قبیلے کی شکل کے کالے پیلے، گتھی، دبلے، پتلے، بھینگے اور چپٹے۔ ہر سال دو کا اضافہ۔ ایک سے ایک نت نئے فرموں میں ڈھل ڈھل کر آ رہا ہے۔ ابھی تو خیر سے دو بھائی کنوارے ہیں ورنہ والد بزرگوار کا نام وہ چلتا کہ کیا کہنے ---- ایک دم میری نظر ان پانچ قوام انسانی کیڑوں پر پڑی۔ اگر ایسی ہی ---- کچھ ایسی ملتی جلتی بھول قدرت سے یہاں ہو جائے۔ خود میرے خاندان میں؟ مجھے پیٹھ پر کھنکھجورے سے رینگتے معلوم ہوئے۔ ویسے ہی میں نے قلم تکیہ کے نیچے سے نکالا کہ لاؤ ان کے یونہی سیاہی سے ڈاڑھیاں لگا دوں ---- یوں ہی جل کر میں نے چاہا ارے! جیسے کسی نے دھم سے میرے کلیجہ پر موسل دے مارا۔ میرا قلم؟ سبز اور کاہی ایور شارپ ان بریک ایبل۔ اس کا نب پیچھے کی جانب ایسے جھکا ہوا تھا جیسے قلا لگانے سے پہلے نٹ اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ایڑیوں سے سر کا دیتا ہے۔ جی چاہا، بس کیا کروں؟ گزشتہ زمانہ کی ایک ہی یادگار، بھولے ہوئے خوابوں کی مٹتی ہوئی تعبیر۔ کسی کا اکلوتا تحفہ، پلنگ کی پٹی پر بے دردی سے ٹھونگا گیا تھا۔

"یا اللہ! کوئی راستہ نجات کا ہے؟" میں اندھوں کی طرح اس مظلوم کو ٹٹولتی رہی۔ گھر کیا ہے چوراہا ہے جو چیز دیکھو تباہ ہوئی جاتی ہے۔ جدھر دیکھو دو چار برتن بول رہے ہیں۔ چار پلنگوں پر اچھل رہے ہیں ---- دو کواڑوں میں جھول رہے ہیں۔ تین پنکھے میں لٹک رہے ہیں ---- دو نے نل کھول کر نہانا شروع کر دیا۔ دو چار بانس کے گھوڑے بنائے لیٹروں کی طرح سارے صحن میں کھڑکھڑاتے پھر رہے ہیں۔ وہ گھڑا الٹا۔ یہ سینی پلٹی۔ وہ دوپٹہ الجھ کے چلا کیچڑ میں لتھڑتا ہوا۔ دو تین بالکل آپ کی پیٹھ کے پیچھے گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور موسل جیسی ٹانگیں گدا گد کمر اور

سر پر پڑ رہی ہیں۔ یا اللہ! مجھے جیسے چکر سا آنے لگا۔ ایک دو ہوں تو بھگتے۔ کوئی اس خوگیر کی بھرتی کو کہاں تک نباہے۔ جو مارو تو فرمایا جاتا ہے۔ "اے ہے کیسی بے دردی سے مارتی ہے۔ اے اپنا خون!"

اپنا خون! خوب! دس بچوں کی ماں کی اولاد ہونے کی یہی سزا ہے گھر کیا ہے۔ محلہ کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے وبا آئے۔ دنیا کے بچے پٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ٹس سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن جاتا ہے۔ پتیلیوں میں صابن دانہ پک رہا ہے۔ سیروں کونین آ رہی ہے۔ پھوڑے پھنسی کے زمانے میں مرہم کا خرچ دال روٹی سے زیادہ۔ جس کونے میں دیکھو پڑے پھائے اور مرہم کی ڈبیاں چپچپا رہی ہیں۔ ٹانگیں سڑ رہی ہیں۔ بخار چڑھ رہے ہیں۔ لینے کے دینے پڑے ہوئے ہیں اور یہ لیجئے بیماری گئی اور وہ چڑیوں کی طرح پھریری لے کر کھڑے ہو گئے۔ پھر ایسا پلچ پلچ کر کھایا کہ چار دن میں پھر ہمارے سینے پر کودوں دلنے کیلئے وہی کسی ہوئی توندیں اور مگدر جیسی ٹانگیں۔ سنتے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں، مرتے ہوں گے، کیا خبر! واہ!

بس اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ دنیا سے منہ موڑ کر الگ تھلگ پڑ رہوں۔ اور ہاں نہیں تو۔ آج ہی سے لو۔ مینو تو خیر وعدہ ہی کر گئی ہے کہ اب کبھی نہ آئے گی۔ رہے مکھن تو انہیں بھی آج ہی دھتکار دیا جائے گا۔ بس ہو چکی دل لگی تجو بھی لڑکا دیئے جائیں گے اور چڑوا چڑو مردی کو تو بس ڈھیل ہی نہیں دوں گی۔ نہ منہ لگاؤں گی۔ نہ یہ سر چڑھ کر ناچیں گے۔ آخر کوئی صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔

"دیکھو ---- دیکھو ---- اب میں کہتی ہوں چنی سے" پاس کے کمرہ سے آواز آئی۔

"کیا کہتی ہو چنی سے" میں نے پھر خیالات کے سلسلہ کو جوڑا۔ جب سروکار بھی ہو اسے۔

"ہائیں چنی یہ کرتہ نہیں پہنتی۔ اسے آکر مار تو۔" پھر کسی نے کہا۔

"وہ آئی---- دیکھ آگئی چنی---- لے اسے مار- کرتہ پہنو پھر-" وہی آواز بڑھی آگے-

"بھاڑ میں جائے کرتہ اور چولہے میں جائے چنی- ہاں نہیں تو چنی نہ ہو گئی ان کی زر خرید لونڈی ہو گئی- کہ اس سے "بی شادی" اور "ہولے" کی خدمات بھی لی جانے لگیں- خدا کی شان-" میں بڑبڑاتی رہی-

"لو بس اب جاؤ- دکھا آؤ پھوپی جان کو-" پھر بولیں-

پڑی تھی مجھے غرض- میں نے عہد بھی ٹھیک وقت پر کیا.... مگر ہمت تو دیکھو ابھی ابھی ماں بیٹیاں کان پکڑ کر نہ آنے کا وعدہ کر گئی ہیں اور دس منٹ بھی نہ گزرے اس بے تکلفی سے آنے کو تیار' خیر-

میں بے رخی سے پیٹھ موڑ کر آرام کرسی پر لیٹ گئی اور ان پانچ توام بچوں کے بے رونق مکار چہرے دیکھنے لگی-

"پڑ پڑ" چھوٹے چھوٹے پیر کمرے کی طرف آتے سنائی دیئے- پانچوں موٹے بنئے جیسے چہروں نے شرارت سے آنکھ ماری' اونہہ!

"دیکھئے پھوپھی جان-" مینو نے اپنی چمکیلی آنکھوں کے وہ تمام برسا کر کہا جن کا جادو وہ خوب جانتی ہے-

دوسرے لمحے وہ مع جوتوں کے میرے گردن پر سوار تھی-

"ہماری فراک!" اس نے میری گردن میں گھٹنہ اڑا کر ناک پر رال ٹپکاتے ہوئے کہا- "دیکھئے-"

"اف یہ بچے!!!"

میں نے چاکلیٹ کا تازہ بنڈل کھولتے ہوئے کہا-

عصمت کے افسانے گویا عورت کے دل کی طرح پر پیچ اور دشوار گزار نظر آتے ہیں۔ مجھے یہ افسانے اس جوہر سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں جو عورت میں ہے۔ اس کی روح میں ہے۔ اس کے دل میں ہے۔ اس کے ظاہر میں ہے، اس کے باطن میں ہے۔

(کرشن چندر)

عصمت کی شخصیت اردو ادب کے لئے باعث فخر ہے۔ انہوں نے بعض ایسی پرانی فصیلوں میں رخنے ڈال دیئے ہیں۔ کہ جب تک وہ کھڑی تھیں، کئی رستے آنکھوں سے اوجھل تھے اردو ادب میں جو امتیاز عصمت چغتائی کو حاصل ہے، اس کا منکر ہونا کج بینی اور بخل سے کم نہ ہوگا۔

(پطرس بخاری)

RHOTAS BOOKS

Ahmed Chambers 5 Temple Road Lahore

Rs 45